ذکر حافظ

سجاد ظہیر

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

ذکرِ حافظ

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

سجاد ظہیر

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

پیش لفظ

سجاد ظہیر ایک رجحان ساز ادیب کے طور پر جانے اور تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اردو میں ترقی پسند تحریک انہیں کی منظم کوششوں کے سبب کامیاب ہوسکی۔ ان کی پہلی شناخت ادیب کی حیثیت سے ہے لیکن انہوں نے سیاسی اور سماجی میدان میں بھی اپنے خلوص اور روشن خیالی کے سبب ایسا مقام بنایا کہ کمیونسٹ پارٹی اور کانگریس نے انہیں اپنا رکن بنایا اور ان کی تجاویز کو خاص اہمیت دی۔ 1936 سے 1941 تک سجاد ظہیر اپنی مصروفیات کی وجہ سے تحریری خدمات کے لیے زیادہ وقت نہ دے سکے۔ 1941 میں جب لکھنؤ کی سنٹرل جیل میں وہ قید تھے تو انہیں فرصت کے وہ ایام میسر آئے جنہوں نے انہیں علمی کارگزاریوں کی طرف ایک بار پھر راغب کیا۔ جیل میں سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں تک کتابیں اور رسائل پہنچنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جاتی تھی یا یوں کہیں کہ اس سلسلے میں حکومتی رویہ خاصا نرم تھا۔ یہیں سے انہوں نے 'سراج مبین' کے عنوان سے مضمون لکھا۔ یہ مضمون ان کے تنقیدی موقف اور کلاسیکی اصناف کے تئیں ان کی عقیدت کو ظاہر کرتا ہے۔ سجاد ظہیر کو یہ احساس تھا کہ ادبی روایت کی تشکیل نو کے جوش میں ہمارا اہم ترین ادبی سرمایہ نظروں سے گر نہ جائے۔ کیوں کہ ہر نئی روایت پرانی روایت کے بطن سے ہی جنم لیتی ہے۔ اسی اصول کے تحت نئی روایت جتنی قابل استقبال ہوتی پرانی روایت بھی اتنے ہی احترام کی مستحق ہوتی ہے۔ 'ذکر حافظ' سجاد ظہیر کی معرکہ آرا تصنیف ہے۔ یہ کتاب انہوں نے بلوچستان کی جیل میں قید کے دوران لکھی تھی۔ اس کتاب میں انہوں نے اپنے اس مضمون کو بھی شامل کرلیا ہے جو انہوں نے

ظ۔انصاری کے مضمون 'غزل باقی رہے گی' کے جواب میں تحریر کیا تھا۔
ظ۔انصاری نے اپنے اس مضمون میں حافظ وسعدی کی غزل گوئی کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔'ذکر حافظ' پر نظر پڑتے ہی ذہن کو سب سے پہلے یہ سوال پریشان کرتا ہے کہ اتنے جدید رویے کے حامل نقاد نے صدیوں پرانی شاعری کو اپنی گفتگو کا موضوع کیوں بنایا، کیا اپنے ہی ہموار کیے ہوئے میدان میں ان کے پیر اکھڑ گئے تھے۔لیکن جب 'ذکر حافظ' کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے بنیادی موقف پر سختی سے کاربند تھے۔ان کا اپنے زمانے اور ہر زمانے کے سنجیدہ ناقدین سے یہ مطالبہ تھا کہ ہر دور کی فنی اور ادبی تخلیقات کو پرکھتے ہوئے اس دور میں مروج اقدار وروایات اور تاریخی ومعاشرتی حالات کو مدنظر رکھنا بہت ضروری ہے۔میرے خیال میں سجاد ظہیر کی ادبی حیثیت کا صحیح اندازہ اس کتاب کے مطالعے کے بغیر نہیں لگایا جا سکتا۔'ذکر حافظ' عرصے سے آوٹ آف پرنٹ ہے اور اپنے نام کے سبب لوگ اس کی اشاعت کے لیے زیادہ فکرمند بھی نہیں ہوتے کہ اس کا بنیادی موضوع اردو ادب تو ہے نہیں۔لہٰذا غالب انسٹی ٹیوٹ نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کتاب کو دوبارہ منظر عام پر آنے کا موقع دینا چاہیے۔امید ہے علمی حلقوں میں اس کاوش کی پذیرائی ہوگی۔

صدیق الرحمٰن قدوائی

’’حافظ کی بیشتر شاعری محبت اور امید، خوشی اور حسن کا ایک ایسا کیف آور اور پُر سحر نغمہ ہے جس کے ذریعے سے اس نے انسانوں کی زندگی میں ’’خوش دِلی‘‘ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح ان کے سرمایۂ مسرت میں اضافہ کیا ہے۔ حافظ کی شاعرانہ عظمت یہ ہے کہ اس نے محض ایک نقطۂ نظر پیش کر کے زندگی کی تنقید ہی نہیں کی اور زندگی کو ایک خاص طریقے سے بسر کرنے کی ترغیب ہی نہیں دی بلکہ جس نظریہ اور زندگی کے اسلوب کا وہ پیغام بر تھا اس کے کلام میں اُس زندگی کا رس اور اس کا آہنگ اِس طرح رچا اور بسا ہوا ہے کہ پڑھنے والے کے حسیات میں وہی شیریں اصوات، وہی نغمے اور اُن کے سُر گونجنے لگتے ہیں۔‘‘

سجاد ظہیر

سخن اندر دہانِ دوست گوہر
و لیکن گفتۂ حافظؔ ازاں بہ

تاریخ وفات خواجہ حافظؔ شیرازی
۷۹۴ھ مطابق ۱۳۸۹ء

سجاد ظہیر
جون، جولائی ۱۹۵۴ء
مچھ، بلوچستان

رفیقِ سخن و چمن

فیض

کے

نام

(۱)

ایک سال سے زیادہ ہوئے، میرے عزیز دوست ظ۔انصاری کا ایک مقالہ ''غزل باقی رہے گی'' کے عنوان سے ''ادب لطیف'' (لاہور) میں شائع ہوا۔فاضل مضمون نگار نے اس مقالے میں، ایک صنف سخن کی حیثیت سے غزل کے موافق و خلاف متعدد دلائل و مباحث کا بڑی خوبی سے جائزہ لے کر آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ غزل بہت سے موضوعاتی اور ہیئتی تغیر کے ساتھ موجودہ زمانے میں باقی رہے گی۔اور اُسے باقی رہنا چاہئے۔

اس کے کچھ عرصے بعد ممتاز حسین نے ''غزل یا شاعری'' کے عنوان سے ایک پُر مغز مقالہ لکھا۔اس میں انہوں نے بہت مضبوط دلائل دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ موجودہ دور میں اپنے معنوی اور ہیئتی عجز کے سبب غزل ہماری شاعری کے بھرپور ارتقا کا ساتھ نہیں دے سکتی اور بہتر یہ ہے کہ ہمارے شاعر غزل گوئی کے مقابلے میں نظم گوئی کی طرف زیادہ توجہ دیں۔

گزشتہ دنوں میں غزل گوئی کی بہتات سے ظ۔انصاری بھی معلوم ہوتا ہے گھبرا گئے ہیں۔اپنے پہلے مضمون میں بدلی ہوئی شکل میں غزل کی انہوں نے موافقت کی تھی اور اب بھی غالباً ایک صنف سخن کی حیثیت سے وہ اچھی غزل کی داد دینے سے احتراز نہیں کریں گے لیکن اپنے آخری مضمون میں انہوں نے کہا ہے:

> (غزل کے) امکانات جو بھی ہوں، لیکن اس کا سب سے بڑا امکان ہے کہ وہ فراریوں کی پناہ گاہ اور تھکے ہوئے مسافروں کا نہاں خانہ بن جاتی ہے۔ یہاں نہاں خانے کی بھی ضرورت آدمی کو ہوتی ہے، لیکن ادب پر ایسا وقت بھی آپڑتا ہے۔ جب اس نہاں خانے پر دھاوا بولنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر ہم اپنی صنف نظم کے دشمن نہیں ہیں تو ہمیں شاعروں کے بازو کھینچ کر غزل کے نہاں خانے سے انہیں نکالنا ہوگا۔''
>
> (''شاہراہ سالنامہ ۱۹۵۴ نیا سال نئے سوال، ص ۱۷۳، ۱۷۴)

اس طرح ظ۔انصاری بھی عملی طور پر اسی رائے کے ہو گئے ہیں جس کا اظہار ممتاز نے اتنی خوبی کے ساتھ کیا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ہمارے شعری ارتقا کا رخ وہی ہے جس کی طرف ان دانش مند نقادوں نے اشارہ کیا ہے۔ حالی نے نظم کے جس دور کو شعوری طور سے شروع کیا تھا وہ بدستور جاری ہے۔اس کے یہ معنی نہیں کہ غزل کہی نہیں جاتی یا اچھی غزلیں کہنا نہیں چاہئے لیکن اس کے یہ معنی ضرور ہیں کہ غزل کو ہماری شاعری کے پہلے ادوار کی طرح اب مرکزی حیثیت حاصل نہیں ہے۔

مثلاً گزشتہ دو برس میں فیض نے چند بہت اچھی غزلیں لکھی ہیں اور کسی نقاد کا ان سے یا کسی دوسرے شاعر سے یہ کہنا کہ تم غزل مت کہا کرو، حماقت ہوگی۔ پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ جب ہم فیض کی شاعری کو مجموعی حیثیت سے جانچیں گے تو معنویت یعنی خیال کی گہرائی اور سچائی اور شعری تخیل کی پرواز اور بوقلمونی کے لحاظ سے ان کی نظموں کا وزن غزلوں سے زیادہ ہوگا۔اس لحاظ سے ''دست صبا'' (پہلے ایڈیشن) کو ہی اگر لیں تو اس کی تین چار نظمیں (دو عشق، ایرانی طلبا، شام زنداں، شیشوں کا مسیحا) تمام غزلوں پر بھاری ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ زندگی کے بعض پہلوؤں کا وہ تخیلی اور جھلملاتا ہوا مرقع جو کہ ان نظموں کے ذریعے سے شاعر نے پیش کیا ہے۔ اپنے اندر ایک عمارتی تفصیل اور تکمیل کی خوبی رکھتا ہے۔

اچھی غزل کے منفرد اشعار دل میں بڑی جلدی جاگزیں ہو جاتے ہیں، وہ بجلی کی طرح چمک کر دل و دماغ میں حرارت پیدا کر دیتے ہیں۔ اشاروں اور کنایوں سے خیال کا رخ ایک درخشاں نکتے پر مرکوز کر دیتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کی خوبی اور افادیت مسلّم ہے لیکن ایک اچھی نظم دل و دماغ کی زمین پر اپنی تخیلی رفتار میں پیش نظر حقیقت کو مختلف اور متنوع پہلوؤں سے آشکار کرتی ہے۔ وہ بہت ساری تشبیہوں، استعاروں، صوتی علامتوں اور فکری جدتوں کے مسالے سے ایک پوری تخیلی عمارت بناتی ہے جو اعمال و واقعات کے بیان، اپنے رنگارنگ حسن اور حقیقی خیال آرائی کے سبب سے زندگی اور اس کے لطیف ترین تقاضوں کی زیادہ مکمل ترجمانی اور عکاسی کرتی ہے۔

اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ سعدی اور خسرو کے زمانے سے لے کر غالب تک فارسی اور اردو شاعری کی مرکزی اور بیشتر بہترین شعری تخلیق غزل کی صنف میں ہوئی اور گو اس زمانے میں بھی نظمیں لکھی گئیں، لیکن مجموعی اور صفاتی حیثیت سے ان کی اہمیت فارسی اور اردو

شعری ادب میں شاید غزلوں کے مقابلے میں کم ہے یہ صحیح ہے کہ تقریباً چھ سو سال کے اس عرصے میں ایسے شاعر بھی پیدا ہوئے جنہوں نے بلند پایہ مسلسل نظمیں، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، قطعے وغیرہ لکھیں، خود شیخ سعدی عظیم نثر نگار ہونے کے علاوہ بوستان کے مصنف کے حیثیت سے بھی بلند مقام رکھتے ہیں۔ اسی عرصے میں فارسی میں خسرو، رومی اور جامی کی مثنویاں او عرفی اور فیضی کے قصائد اور دوسری نظمیں لکھی گئیں، اردو میں شعرائے دکن کی مثنویاں، میر حسن کی 'سحر البیان'، نظیر اکبر آبادی کی نظمیں اور انیس کے مرثیے ظاہر کرتے ہیں کہ بہترین شعری صلاحیتوں کا اظہار نظم کے ذریعے سے بھی ہو رہا تھا پھر بھی شعر نے تخیل کے جوہر لطیف کی حیثیت سے جو تابانی اور معنویت حسن اور دل کشی صنف غزل میں پیدا کی اور اسے جو مقبولیت اور ادبی مرکزیت حاصل ہوئی وہ اس طویل دور میں کسی دوسری صنف سخن کو نہیں ہوئی۔

اس بات کے واضح اظہار کی ضرورت آجکل بہت زیادہ ہے چونکہ مبتذل تہی مایہ اور شاعری کے عظیم اخلاقی، جمالیاتی اور فنی منصب سے محروم، بہت سے متشاعروں نے بیشتر غزل کو ہی اپنا تختۂ مشق بنایا تھا، اس لیے حالی اور ان کے پیروں نے بجا طور پر اس قسم کی شاعری کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اسے ایک 'ناپاک دفتر' کا خطاب دیا۔ اور ہم بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عہد حاضر میں ایسی عظیم یا اچھی شاعری جس سے آج کل مکمل ذہنی اور روحانی تسکین ہو غزل کے سانچے میں محدود نہیں کی جاسکتی لیکن بعض لوگ جب ان باتوں سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ گزشتہ چھ سو سال میں فارسی اور اردو غزل کے جو بہترین نمونے ہیں وہ لازمی طور پر عظیم شاعری نہیں ہو سکتے، اور یہ کہ غزل ایک صنف سخن کی حیثیت سے بیشتر جاگیری دور کے انحطاط اور افراتفری اور انتشار کی عکاسی کرتی ہے تب میرے خیال میں، ہم سخت غلطی کرتے ہیں۔

ہم بجا طور پر جاگیری دور کے غیر علمی نظریوں اور طرز فکر کو مسترد کرتے ہیں۔ سماجی حقیقت کو صحیح اور معروضی طور پر سمجھنے کی راہ میں جو رکاوٹیں اور فراری پناہ گاہیں ہیں ان کا دور کرنا ضروری ہے۔ قبائلی یا جاگیری عہد کے بہت سے عقائد اور آرٹ کے مظاہر جو تاریخی ارتقا اور جدید علوم کی روشنی میں معمولی طور پر ختم ہو گئے ہوتے بعض غرض مند حلقے انہیں مصنوعی طور پر زندہ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس مصنوعی تاریکی میں عقل، سائنس، اخلاق اور انسانیت کی شمعیں روشن کرنا ہمارا فرض اولین ہے نئی زندگی کی تعمیر کی کاوش اپنے اظہار کے لئے یقینی فن اور آرٹ کے نئے سانچے بھی ڈھالے گی۔ لیکن انحطاطی اور فرسودہ نظریوں کو مسترد کرتے وقت یہ خیال رکھنا ضروری

ہے کہ تاریخ کے ان گزشتہ ادوار میں ماڈی اقدار کی پیداوار کے ساتھ ساتھ تہذیبی اور فنی اقدار کی تخلیق بھی ہوتی تھی اور تاریخ کے معنی محض بادشاہوں اور امرا کی سلطنت و امارت کی داستان کے نہیں ہیں۔ بلکہ ان لوگوں کے اعمال کے ہیں جو اپنی جسمانی اور ذہنی محنت اور جانفشانی سے زندگی کی مادی، علمی اور فنی اقدار کی تخلیق کرتے تھے بسا اوقات ان اقدار کی تخلیق میں آزادی خواہوں، محروموں اور مظلوموں کی اس آویزش کی روح بھی ہمیں نظر آتی ہے جو وہ جابر اہل اقتدار کے خلاف کرتے تھے اور بسا اوقات تاریخ کے صفحوں پر خود اہل اقتدار کے ایسے افراد ہمیں نظر آتے ہیں جن کی سرپرستی میں فلاح اور تہذیب کی قوتوں کو ترقی ہوئی۔ بغیر اس نکتہ کو ذہن میں رکھے ہوئے ازمنۂ وسطیٰ میں علوم، فنون لطیفہ، فن تعمیر، موسیقی، رقص، سنگ تراشی، فلسفہ، شعر و ادب اور روشن خیال انسانی تصورات کا گونا گوں شکلوں میں ابھرنا ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ہمارے ماضی کے شاندار تمدن کا یہی ترکہ ہے جس نے ہمیں تہذیب اور انسانیت سے مزیّن کیا ہے اور جس کے بغیر ہم مستقبل کے اور بھی شاندار تمدّن کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔

(۲)

اس طویل تمہید کا مقصد چند ایسے مسائل کو اٹھانا ہے جو ظ۔انصاری کے مذکورہ بالا مقالے (غزل باقی رہے گی) میں سعدی اور حافظ (خاص طور پر حافظ) کی غزل کے متعلق بعض بیانات سے پیدا ہو گئے ہیں اور جن سے مجھے کافی حد تک اختلاف ہے میں یہ پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ بہ حیثیت ایک صنفِ سخن کے غزل کے بارے میں موجودہ دور کے لئے جو نتائج انہوں نے اپنے اس مضمون اور بعد کے مقالے میں اخذ کئے ہیں ان سے میں فی الجملہ متفق ہوں۔

ظ۔انصاری کہتے ہیں کہ سعدی نے غزل اور غزل گوئی کو موضوع کے اعتبار سے بہت زیادہ وسعت دی، لیکن ان کے زمانے میں جو ایران کی ملکی حکومت کا زوال ہوا اور ہلاکو خاں کے حملے سے جو تباہی واقع ہوئی اس نے سعدی کی طبیعت میں طنز بھر دیا۔انہوں نے ظ۔انصاری کے مطابق:

> ''ان اداروں، شخصیتوں، جماعتوں اور طور طریقوں کے خلاف بھرپور طنز کیا جو سماج کے زوال کا سبب تھے۔ لوگوں کی بدحالی کا سبب تھے اور ریاکاری پھیلانے کا باعث تھے۔''

شیخ سعدی کے اس طنزیہ رجحان کے ثبوت میں ظ۔انصاری نے ایک شعر لکھا ہے:

> من ار چہ عاشقم و رند و مے کش و قلاش
> ہزار شکر کہ یارانِ شہر بے گنہ اند

بدقسمتی سے یہ شعر سعدی کا نہیں، بلکہ حافظ کا ہے اور اس کے پہلے مصرعے میں (مجھے امید ہے کہ نادانستہ!) انصاری صاحب نے جو اصلاح دی ہے وہ بھی غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ میرے پاس دیوان حافظ کا جو نسخہ ہے (شائع کنندہ شیخ مبارک علی لاہور جو نامی پریس کان پور محمد رحمت اللہ رعد کے عمدہ نسخہ کی نقل ہے) اس میں اس شعر کا پہلا مصرع یوں دیا ہے:

''من آرچہ عاشقم و رند و مست و نامہ سیاہ'' (ص ۱۷۵)

مولانا شبلی نے شعرالعجم (جلد دوم، ص ۲۳۰) میں یونہی لکھا ہے۔ لیکن یہ حافظے کی معمولی اور غیر اہم چوک ہے۔ ظ۔ انصاری، اصل میں سعدی کا یہ مشہور شعر مثال کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہوں گے:

گر کند میل بہ خوباں دل من خُردہ مگیر
کیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

خواجہ حافظ نے شیخ سعدی کے اسی مضمون کو تقریباً انہیں لفظوں میں دوسری طرح سے باندھا ہے۔ سعدی کے شعر کا دوسرا مصرع ضرب المثل بن گیا ہے۔[1]

سعدیؔ کے ضمن میں ظ۔ انصاری نے اپنے مقالے میں صرف چھ سات سطریں لکھی ہیں اور کہا ہے کہ سعدی نے اپنی غزلیات میں حسن و عشق کے جذبات کی ترجمانی کے علاوہ اخلاقیات اور تصوف کے تصورات شامل کئے اور سماج کے برے عناصر کے خلاف طنز کا استعمال کیا۔

مجھے تسلیم ہے کہ اس مقالے میں ظ۔ انصاری، سعدی کی شاعری یا ان کی ادبی خصوصیات سے بحث نہیں کر رہے ہیں لیکن جو جملے انہوں نے سعدی کے متعلق لکھے ہیں وہ اس قدر تشنہ ہیں اور ایک عظیم ترین شاعر اور ادیب کے متعلق اس قدر ناکافی کہ ان کو پڑھنے والا (اگر وہ پہلے سے سعدی کی اہمیت سے واقف نہیں ہے) سخت غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔

ظ۔ انصاری جیسے بالغ نظر نقاد کا سعدی کے متعلق محض یہ کہنا کہ انہوں نے 'حسن وعشق کے جذبات کی ترجمانی' کے علاوہ 'غزل کے دامن کو پھیلایا' اس میں اخلاقیات وتصوف کو زیادہ سے زیادہ دخل دیا'' اور ان عناصر کے خلاف 'بھرپور طنز کا استعمال کیا جو ان کی نظر میں سماج کے زوال کا سبب تھے''، حیرت انگیز بھی ہے اور افسوسناک بھی۔ ان باتوں سے ہمیں ایک غزل گو کی بھی حیثیت سے سعدی کی شاعری کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ سعدی تو خیر سعدی ہیں کسی بھی شاعر کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ حسن وعشق کے مضمون کے علاوہ تصوف اور اخلاق کے متعلق شعر کہتا ہے اور سماج کے بعض عناصر پر طنز کرتا ہے، اس کے متعلق کچھ نہ کہنے کے برابر ہے۔

سعدی کے بعد فاضل مضمون نگار نے خواجہ حافظ کی شاعری پر ڈیڑھ دو صفحوں میں تبصرہ کیا ہے۔ ان سطور میں دراصل یہی تبصرہ معرضِ بحث ہے۔

ظ۔ انصاری کا کہنا ہے کہ ''سعدی کی غزلوں میں اپنے ماحول سے غصے کا اظہار تو

تھا لیکن ان میں اپنے ماحول سے اتنی بیزاری، نفرت اور فرار نہیں پایا جاتا جو حافظ کی غزلوں کے رگ و ریشے میں بسا ہوا ہے"
وہ کہتے ہیں:

> "حافظ نے فرار میں نجات چاہی اور اپنے گرد انہوں نے عیش کوشی اور سکون پسندی کا حصار کھینچ لیا۔"

اور پھر لکھتے ہیں:

> "حافظ کی غزلوں میں وہ لذت پر مبنی، بے ثباتیِ عالم، داخلیت، فرار اور زندگی کی تاریکیوں کو جامِ عیش میں ڈبو دینے کا جذبہ رچا ہوا ہے جو خود حافظ کی زندگی میں رس بس گیا تھا اور جو اس وقت تک ملک کے کسی شاعر کے یہاں اتنا حسین اور دلکش بن کر نہیں آیا تھا"

حافظ کی شاعری کو حسین اور دلکش تسلیم کرنے کے بعد شاید ظ۔ انصاری نے محسوس کیا کہ لوگوں کو غلط فہمی نہ ہو جائے اس لئے انہوں نے حافظ کے چار شعر منتخب کئے اور ان کے متعلق اپنا یہ حیرت انگیز فیصلہ دے دیا۔

> "اگر حافظؔ، خواجوؔ، سلمان ساوجیؔ اور ان کے بعد آنے والے غزل گوؤں کی نسل کے تمام دیوان نچوڑے جائیں تو ان سے صرف یہ اتنا پیغام ملے گا جو اوپر کے چار شعروں میں موجود ہے۔"[ع]

میں اس جملے کو پڑھ کر بار بار اپنی آنکھیں ملتا تھا کہ یہ کیا لکھ دیا گیا ہے۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ "ان کے بعد آنے والی نسل" سے حافظ کے بعد کے صرف سو پچاس سال مراد ہیں لیکن آگے پڑھنے پر معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہے۔ ظ۔ انصاری کا کہنا ہے کہ حافظ کی شاعری کا 'پیغام' یعنی اس کے معنوی خصائص جاگیری عہد کے انحطاط و زوال اور سماج میں سراسیمگی اور افراتفری پھیل جانے کا نتیجہ تھے۔ چونکہ ولی کے زمانے میں، اور اس کے بعد ہمارے یہاں بھی ویسے ہی حالات تھے، اس لئے یہاں کی غزل پر بھی وہی حافظ کا رنگ چھایا رہا جسے وہ آخر میں اور بھی اختصار کے ساتھ "داخلیت اور فرار، انفعالی تصوف اور عام اداسی کے مضامین" کہتے ہیں۔ کسی قدر زیادہ تفصیل سے ظ۔ انصاری نے حافظ اور اس کے بعد کے تمام غزل گو شعرا کا 'نچوڑ' حسب ذیل الفاظ میں نکالا ہے۔ ظ۔ انصاری کے مطابق حافظ اور اس کے بعد کے تمام غزل گو شعرا کا کہنا بس یہ ہے:

''بیرونی دنیا سے اندرونی دنیا کی طرف فرار کرو۔ خارجی ماحول تاریک ہے اسے قرار نہیں۔ اس میں سکون نہیں۔ فلسفے سے کوئی راہ نہیں سوجھتی۔ جدو جہد کا حاصل کچھ نہیں۔ زندگی ہجوم غم میں گرفتار ہے۔ اس لئے زندگی کے بے رحم ہاتھوں سے جتنے لمحے چھین کر اپنی ذاتی مسرت میں گم کر سکو بس وہی تمہارے لمحے ہیں۔ البتہ جب اچھے سے بُرا وقت آیا ہے تو کبھی نہ کبھی بُرے سے اچھا وقت بھی آ ہی جائے گا۔ قصہ ختم۔''

ظاہر ہے کہ اگر حافظ اور دوسرے شعرا کا پیغام یہی ہے تو اسے کلیۃً مسترد کرنا ہر ایک سمجھ دار آدمی کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔ البتہ ظ۔ انصاری یہ بھی کہتے ہیں کہ اس ہمہ گیر تاریکی میں کبھی کبھی باہر سے روشنی کی کرن آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً حافظ کا یہ شعر:

نفسِ بادِ صبا مشک فشاں خواہد شد   عالم پیر دگر بارہ جواں خواہد شد

اردو شاعروں کے ساتھ انہوں نے کسی قدر رعایت کی ہے اور کہا ہے:

''حافظ کے طرز پر غزل کی عام ڈگر بن جانے کے باوجود..... ان کے یہاں بعض مرتبہ ایسے اشعار اور اس قسم کا لب ولہجہ بھی ملے گا جو تندرست جذبات، توانائی، زندگی، تمنا اور اٹھان کے پیغامبر ہیں۔''

لیکن یہاں بھی ظ۔ انصاری کے نزدیک، زیادہ حاوی جذبہ انحطاطی ہے۔ اسی لئے:

''غزل صرف انحطاطی شاعری کا دوسرا نام ہے''

میں اس وقت بحث کو حافظ کی شاعری کے متعلق ظ۔ انصاری نے جو لکھا ہے صرف اسی حد تک محدود رکھنا چاہتا ہوں، گو میرا خیال ہے کہ اردو کے اساتذہ کے متعلق ظ۔ انصاری کی رائے بھی ٹھیک نہیں ہے اور ان کا فیصلہ ہمارے سب سے بڑے شعرا پر تو یقینی عاید نہیں کیا جا سکتا (مثلاً: ولی، سودا، میر درد، میر، نظیر اکبر آبادی، انیس اور غالب پر)

خوش قسمتی سے میں ان لوگوں میں ہوں جو ظ۔ انصاری سے ذاتی طور پر واقف ہیں، اور مجھے معلوم ہے کہ منجملہ اور خوبیوں کے وہ عربی، فارسی اور اردو کے ادب عالیہ پر نہ صرف اچھی نظر رکھتے ہیں بلکہ ان کا ادبی اور شعری ذوق بھی شستہ اور پاکیزہ ہے۔ پھر انہوں نے ادب اور تاریخ کے جدید علمی نظریوں پر بھی عبور حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں ان کا عملی تجربہ اور ان کی ذہانت وسنجیدگی ان کی بیشتر تحریروں سے ظاہر ہوتی ہے۔ مجھے اب یہ تو یاد نہیں ہے

کہ حافظ کی شاعری پران کی اور میری گفتگو کبھی ہوئی ہے یا نہیں، لیکن اس کا مجھے یقین ہے کہ زیر نظر مقالے میں جو کچھ بھی انہوں نے حافظ کے بارے میں لکھا ہے، اس کے باوجود وہ نظم حافظ کے بہت دلدادہ ہوں گے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایسا نہ ہو۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اس لدادگی کو وہ اپنی 'کمزوری'، ''غلط ادبی تربیت' 'یا انحطاط پذیر جاگیری تصورات اور اس کے ماحول کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور اپنے شعوری لمحوں میں خودکو اس'' آلائش سے پاک کر لینے پر پشیمان ہیں۔

بہت سے روشن خیال دانش وراس کشمکش میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ ذہنی مجاہدہ ایک مستحسن عمل ہے۔ اس لئے کہ فرسودہ اور جدید رجعتی عقائد، سوچنے اور سمجھنے کے طریقوں عادتوں اور رجحانات کو ترک کئے ہوئے بغیر ہم میں وہ نئی سمجھ داری اور حقیقت کے مشاہدے کی صلاحیت نہیں آسکتی جو نئے ادب وفن کی تخلیق کے لئے ضروری ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ حافظ کی شاعری پر'' انفعالی تصوف، فراریت، داخلیت اور لذت پرستی'' کا الزام لگا کر اپنے تہذیبی ورثے کے اس انمول رتن کو ماضی کی بہت سی ان چیزوں کے ساتھ جو آج ہمارے لئے بے مایہ اور مضرت رساں ہیں، کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دینے میں ظ۔ انصاری نے بڑی غلطی کی ہے۔

میرے نزدیک اس غلطی کی دو بنیادی وجہیں ہیں:

پہلے تو یہ کہ حافظ کی ساری شاعری سے اس کا پیغام 'نچوڑ' لینے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ غیر ادبی اور غیر علمی ہے۔

دوسرے یہ کہ تاریخ کے علمی، سائنسی طبیعیاتی نظریے کو حافظ کے دور کے حالات اور ان سے پیدا ہونے والے نظریوں اور فن پر غلط طریقے سے منطبق کیا گیا ہے۔ مادی، سماجی حالات اور فنی تخلیق میں جو رشتہ ہے اسے غلط اور میکانکی طریقے سے سمجھا گیا ہے۔

حواشی:

ا۔ اس مضمون میں اسی قسم کی ایک اور غلطی ہے جو زیادہ سنگین ہے۔ ظ۔ انصاری نے لکھا ہے کہ ذیل کے دو مصرعے انیس کے ایک 'شاہکار مرثیے' کے ہیں:

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے   رن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے

میرا خیال ہے کہ یہ مصرعے میر انیس کے نہیں بلکہ میرزا دبیر صاحب کے ایک مرثیے

کے ہیں غالباً مولانا شبلی نے موازنہ انیسؔ و دبیرؔ میں میرزا صاحب کے اس بند پر بحث کی ہے جوان مصرعوں سے شروع ہوتا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ یہ پورا بند فصاحت کے اصول کے مطابق نہیں ہے۔ لکھنؤ میں 'انیسیے' اس بند کے تیسرے مصرعے "رستم کا بدن زیر کفن کانپ رہا ہے" کے بے جوڑ ہونے اور بے تکے پن سے زمین کا قلابہ آسمان سے ملا دینے پر 'دبیریوں' کا کافی مذاق اڑاتے ہیں۔

۲۔ وہ چار شعر جن میں ظ۔ انصاری کے مطابق حافظ اور ان کے بعد آنے والے غزل گو شعرا کی شاعری (یعنی تقریباً چھ سو سال) کے پیغام کا 'نچوڑ' ہے، یہ ہیں۔

۱ حدیث از مطرب و مئے گو و راز دہر کمتر جو   کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمارا

۲ حاصل کارگہ کون و مکاں ایں ہمہ نیست   بادہ پیش آر کہ اسباب جہاں ایں ہمہ نیست

۳ زاں پیشتر کہ عالم فانی شود خراب   مارا بہ جام بادۂ گلگوں خراب کن

۴ بیار بادہ کہ ایام غم نہ خواہد ماند   چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند

(۳)

سخن سنجی ایک فن لطیف ہے۔اس کی ایک خصوصیت جو اسے بعض دوسرے فنون لطیفہ (موسیقی، رقص، مصوری) سے ممیز اور ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ جس مسالے سے اس کی تخلیق ہوتی ہے (الفاظ) وہ بامعنی اور پرصوت ہے۔اس لئے اس کے وسیلے سے دوسرے فنون لطیفہ سے پیدا ہونے والی کیفیات اور معانی کا بیان واظہار کیا جاسکتا ہے۔ یہ خصوصیت شاعری کو غیر معمولی وسعت عطا کرتی ہے۔الفاظ کے وسیلے سے فطرت اور زندگی کے مظاہر، ان کے باہمی علاقے، علمی حقایق، جذباتی اور حسیاتی کیفیات کی نہ صرف رنگین نقاشی اور مترنم نغمہ آفرینی ہوسکتی ہے، بلکہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی آرزوئیں، ہمدردیاں اور قلبی واردات، اس کے تمام چھوٹے اور بڑے مقاصد حیات ومیلانات کا شاعری میں اس طریقے سے اظہار کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے سننے یا پڑھنے والوں کو ایک خاص طریقے سے متاثر کرتی ہے، ان میں تبدیلی پیدا کرتی ہے اور ان کے دل ودماغ کو ایک خاص سمت موڑ دیتی ہے۔ان وسیع معنوں میں یقیناً ہر شاعر پیغامبر ہوتا ہے اور اس کا پیغام جتنا زیادہ سچائی اور حقیقت پر مبنی ہوگا اور جتنا زیادہ حسین، انوکھے اور پرلطف طریقے سے وہ اپنے اس پیغام کو اپنے قارئین یا سامعین تک پہنچائے گا اتنا ہی زیادہ وہ کامیاب شاعر ہوگا۔

لیکن اس اصول کو مرتب کر لینے کے بعد ہماری دشواریاں ختم نہیں ہوتیں بلکہ شاید وہ شروع یہیں سے ہوتی ہیں۔شاعر کے عقائد، اس کا علم وفلسفہ، اس کا نظریہ حیات اپنے زمانے اور اپنی قوم کے عقائد، علم اور فلسفے سے محدود ہوتا ہے۔پھر اس پر اپنے مخصوص طبقے اور گروہ کی بھی چھاپ ہوتی ہے۔اس کے لئے یہ تو ممکن ہے کہ اپنے عہد کے بہترین اور بلندترین خیالات، احساسات اور حقائق اور زندگی کے تعلقات اور رشتوں کا سچا، موثر اور حسین ترین اظہار کرے لیکن اس کی تخیل کی سب سے اونچی پرواز بھی اس حد سے باہر نہیں ہوسکتی۔

پھر ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ جب ہمارے عقائد بدل جائیں، ہمارے علم میں اضافہ ہوجائے، خود معاشرت کی شناخت اور اس کا ڈھانچہ بدل جائے اور زندگی کے بہت

سے رشتے اور تعلقات پہلے کی طرح کے نہ ہوں، اور ہمارے سماجی آدرش بالکل مختلف ہوں، تب بھی ہم تین ہزار یا دو ہزار یا کئی صدیوں پہلے کے کلام سے محظوظ اور مستفید ہو سکیں اور انہیں صرف آثار قدیمہ کا درجہ نہ دیں؟ قدیم کلاسیکی اساتذہ کا کلام ہمارے لئے کون سے 'پیغام' کا حامل ہو سکتا ہے؟

مثلاً اگر ہم مشہور یونانی رزمیہ نظم ایلیڈ کو لیں، جو ہومر سے منسوب کی جاتی ہے تو اس میں یونان اور ٹرائے (یا ایلیم) کے درمیان ایک وحشت ناک لڑائی کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جو شروع اس وجہ سے ہوئی کہ ٹرائے ایک شہزادہ پیرس نے، یونان کے ایک شہر کے بادشاہ مینی لاس کی بیوی، خوبصورت ہیلن کو، جب کہ وہ اس بادشاہ کا مہمان تھا اغوا کر لیا اور پھر اسے واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ یونان کے تمام بادشاہ اور سردار ایک بڑے بیڑے پر فوج لے کر ایشیائے کوچک کے شہر 'ٹرائے' پر چڑھ گئے، جس کا انہوں نے محاصرہ کر لیا، ٹرائے کے بادشاہ اور شہزادوں کی مدد کے لئے ان کے بہت سے حمایتی بادشاہ اور سردار فوجیں لے کر آئے اور یہ خوں ریز جنگ دس برس تک جاری رہی۔ ایلیڈ میں لڑائی کے آخری چالیس پچاس دنوں کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔

زمین پر جو جنگ ہو رہی تھی اس میں دیوتاؤں نے بھی دلچسپی لینی شروع کر دی۔ ان دیوتاؤں کا سربراہ زیئس، اپنی بیویوں، بیٹوں اور بیٹیوں اور دوسرے ماتحت دیوتاؤں کو اس جنگ میں کبھی ایک اور کبھی دوسرے فریق کی طرف داری کے لئے اکساتا اور حکم دیتا، اور جس طرح زمین پر بادشاہ لڑتے تھے، اسی طرح یہ دیوتا بھی کبھی کبھی آپس میں لڑ جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔ اور زیئس کی منظور نظر بیوی خود اپنے شوہر دیوتا کو چکمہ دینے سے باز نہیں رہتی تھی جس کے سبب سے زیئس کو اسے بار بار ڈانٹنا اور دھمکانا پڑتا تھا۔ ساری نظم دیوتاؤں اور انسانوں کے اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔

قدیم یونانی ہومر کی نظموں کو الہامی سمجھتے تھے اور انہیں مذہبی تقدس کا درجہ حاصل تھا۔ صدیاں گزر گئیں (تقریباً تین ہزار سال) وہ معاشرت بھی ختم ہو گئی۔ اور وہ عقائد بھی مٹ گئے جن کا اظہار ان نظموں میں کیا گیا ہے، اور وہ زبان بھی اب مردہ ہے جس میں یہ نظمیں کہی گئی تھیں۔

تو پھر وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے ہومر کی نظمیں زندہ اور پائندہ ہیں اور ان کا شمار دنیا کے ادب عالیہ میں ہوتا ہے۔ وہ خصوصیت جو ان نظموں کو زندہ رکھتی ہے یہ ہے کہ جن

انسانوں کا (نیز دیوتاؤں کا بھی، اس لئے کہ وہ بھی دراصل ایک خاص ماحول میں انسانوں کا ہی ذہنی عکس ہیں) شاعر نے یہاں پرانی سچائی، گہرائی اور چابک دستی سے نقشہ کھینچا ہے۔ وہ انسان بدلی ہوئی شکل میں اور بہت سی نئی حالتوں اور کیفیتوں کے ساتھ ابھی تک زندہ اور باقی ہیں۔

ہومر نے ایلیڈ میں جس جنگ کا بیان کیا ہے اس کی تاریخی واقعیت بھی مشکوک ہے۔ اُس نے ان اساطیر کو نظم کیا ہے جو بہت پہلے سے یونانی عوام میں رائج تھے۔ ہومر کی عظمت اس میں ہے کہ اس نے جن انسانوں اور انسانوں ہی جیسے دیوتاؤں کے کردار اس نظم میں پیش کئے ہیں ان کے اعمال، ان کے احساسات، ایک دوسرے کے ساتھ ان کا برتاؤ سچے اور حقیقی ہیں۔ وہ ہومر کے اپنے زمانے کے انسان ہیں، ان کے خیالات اور ان کے اعمال، ان کی محبتیں اور نفرتیں، ان کی شجاعت اور ان کی بزدلی ان کی فیاضی اور ان کی حرص، ان کے زندگی کے مقاصد، خواہشیں اور آرزوئیں یونانی سماج کے تمام تناقصوں، کشمکش، اور تناؤ کی ساری روح کو اسیر کر لیتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تلواروں کی اس جھنکار اور زندہ نفوس کی اس بے پناہ پیکار میں جہاں خیر و شر، کمزوری اور استقامت، حماقت اور اتفاقی سانحے اور دور اندیشی اور سمجھ داری سبھی مل جل کر حقیقت کا ہمہ گیر جال بنتے ہیں، انسان اور انسانیت کے ساتھ ایک گہری دلچسپی اور ہمدردی کا جذبہ شروع سے آخر تک کارفرما معلوم ہوتا ہے۔

مثلاً آج ازدواجی تعلقات کا معیار تین ہزار سال پہلے کے یونانی سماج سے بہت بدلا ہوا ہے۔ لیکن جس طرح ہومر نے ایک جگہ پر ٹرائے کے سب سے بہادر سردار ہکٹر کی اپنی بیوی، اینڈروما کی سے رخصت کا بیان کیا ہے وہ اپنی سچائی اور دردمندی کے سبب سے اب بھی ہمیں متاثر کرتی ہے۔

ہکٹر زرہ بکتر اور خود پہنے ہوئے انڈروما کی سے رخصت ہونے کے لئے آیا ہے پاس ہی ایک خادمہ ان کے چھوٹے سے بچے کو گود میں لئے کھڑی ہے۔ ہومر لکھتا ہے "ہکٹر نے اپنے بچے کی طرف دیکھا اور وہ مسکرایا لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔" اینڈروما کی سمجھ گئی کہ ہکٹر کیوں آیا ہے وہ رو رو کر اس کو لڑائی پر جانے سے روکنے کے لئے منتیں کرنے لگی۔ ہکٹر نے اسے سمجھایا کہ ٹرائے کے سب سے بہادر رہنما کی حیثیت سے جب اس کے سب بھائی دور ساری قوم لڑ رہے ہیں، اس کے لئے بھی میدان جنگ میں جانا ضروری ہے، گو اس کا دل یہ کہہ رہا ہے کہ وہ اس لڑائی سے زندہ واپس نہیں لوٹے گا، ٹرائے کا شہر تاخت و تاراج کیا جائے گا اور دشمن اس کی بیوی اور بچے کو غلام

بنائیں گے۔

ہومر لکھتا ہے:

”جب اس نے اپنی بات ختم کی تو بہادر ہکٹر نے اپنے بچے کو گود میں لینے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ لیکن بچہ چلا کر اپنی دایا سے چمٹ گیا۔
وہ اپنے باپ کے خود اور اس پر لگے ہوئے گھوڑے کے بال کے پھُندنے سے ڈر گیا جو اس پر خوفناک طرح سے جھکے ہوئے ہل رہے تھے۔ اس پر اس کے ماں اور باپ ہنس پڑے۔

شریف ہکٹر نے جلدی سے اپنا خود اتار دیا اور اس چمکدار چیز کو نیچے زمین پر رکھ دیا اور بچے کو گود میں اٹھا کر اسے ہلا ہلا کر زیئس اور دوسرے دیوتاؤں سے دعا مانگی۔

”اے زیئس: میرے بچے کو بھی میری طرح ٹرائے میں عزت اور وقار بخش! یہ بھی میری طرح مضبوط اور بہادر ہو اور ایلیم کا ایک بڑا بادشاہ بنے! اور جب وہ جنگ کر کے واپس لوٹے تو لوگ کہیں، یہ تو اپنے باپ سے بھی زیادہ اچھا آدمی ہے!“
ہکٹر نے بچے کو اپنی بیوی کو تھما دیا جس نے اسے اپنی مہکتی ہوئی چھاتیوں سے لگا لیا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی تھیں۔“

یہ ترجمہ 'ایلیڈ' کے ایک انگریزی ترجمے سے کیا گیا ہے ظاہر ہے کہ اس ترجمے در ترجمے اور نظم کو نثر میں تبدیل کرنے میں شعر کے تاثر اور اس کی موسیقیت کا بہت سارا حصہ ختم ہو گیا ہوگا۔ تاہم جو حصہ بھی باقی رہ گیا ہے اس سے بھی ایک عظیم فن کار کی معنوی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ہکٹر یہاں پر اس شجاع انسان کا مجسمہ ہے جسے اپنے قومی یا بلند نصب العین کے سلسلے میں عائد ہونے والے فرائض اور نجی فرائض کے درمیان فیصلہ کرنا ہوتا ہے اور وہ اپنا جی کڑا کر کے اور سینے پر پتھر کی سل رکھ کر یہ جانتے ہوئے بھی کہ اول الذکر راستے میں اس کی ہلاکت کا خطرہ ہے، پھر بھی اسے ہی چنتا ہے۔

ہکٹر کی بیوی کی اپنے شوہراور بچے سے والہانہ محبت، اورایک خوش وخرم اور مطمئن زندگی کی تمنااس کی آنکھوں سے غم کاایک سیلاب بن کر پھوٹ پڑتی ہے۔

پھرماں اور باپ دونوں کی محبت اور رفاقت کی نشانی، اپنے بچے سے ان کا پیار، یہاں پر ہومر نے اپنی آواز سے ماں اور باپ کی محبت کے فرق کو کتنی دل آویزی اور سچائی سے واضح کیا ہے۔ ماں جانتی ہے کہ اس کا شوہراپنے اور پورے خاندان کے لئے سخت خطرہ مول لے رہا ہے اور بیحد المناک مستقبل کے خیال سے وہ بے چین ہے لیکن اس شدید المناکی اور ہلاکت کے احساس کے درمیان بھی جب وہ اپنے بچے کواس کے باپ کے ہاتھوں سے لے کراپنی مہکتی ہوئی چھاتیوں سے لگالیتی ہے تو ایک نئی زندگی کا تخلیقی احساس موت اور ہلاکت اور تباہی پر جیسے غالب آجاتا ہے اور آنسوؤں کی چادر کے پیچھے سے ماں کی مسکراہٹ جھلک پڑتی ہے۔ انسانی کردار کی یہ حسین تشکیل چند چھوٹے چھوٹے لیکن معنی خیز اور مناسب اقوال، اعمال اور واقعات کو بیان کر کے کی گئی ہے اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہومر نے یہاں جو مرقع پیش کیا ہے اس میں زندگی کی حرارت موجود ہے وہ زندہ ہے۔

اب ہم ہومر سے ایک دوسری مثال لیتے ہیں۔

لڑائی کے دوران میں یونانی فوج کے سب سے شجاع اور سربرآوردہ شہزادے ایکلیز کے عزیز دوست اور اس کے رتھ بان پیٹرولوکس کو ٹرائے کے ہکٹر نے قتل کر دیا ہے۔ اس کی وجہ سے تمام یونانی فوج میں تہلکہ مچ گیا ہے۔ یہاں تک کہ ایکلیز کے رتھ کے گھوڑے بھی جن کو پیٹرولوکس ہانکا کرتا تھا اپنے ہنکانے والے کی موت سے متاثر ہیں یہ گھوڑے ہومر کے عقیدے کے مطابق آسمانی تھے اور دیوتاؤں نے انہیں ایکلیز کے باپ شاہ پیلئس کو تحفہ دیا تھا۔ 'آسمانی' ہونے کی وجہ سے ان کی خصوصیت یہ تھی کہ دنیا کے دوسرے گھوڑوں کی طرح وہ فانی نہیں بلکہ لافانی تھے۔ ہومران کے بارے میں لکھتا ہے:

> "رتھ بان کو سفاک قاتل ہکٹر نے مٹی میں روند دیا ہے، رو رہے تھے۔
> انہیں شائیں شائیں کرتے ہوئے کوڑے لگائے جاتے تھے، انہیں چمکارا
> جاتا تھا، انہیں بے تحاشا گالیاں دی جاتیں، لیکن گھوڑوں کی یہ جوڑی اپنی
> جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتی تھی جس طرح کسی مزار پر کتبہ کا پتھر گڑا ہوتا
> ہے، وہ اپنے خوبصورت رتھ کے سامنے، اپنے سروں کو نیچے جھکائے

ساکت کھڑے تھے۔ان کی آنکھوں سے گرم آنسو بہہ کر زمین پر گر رہے تھے۔اور وہ اپنے گم شدہ رتھ بان کے غم سے نڈھال تھے۔

ان کے گھنے ایال گردن پر رکھے ہوئے ساز کے گدّے سے نیچے کی طرف گرے نم اور میلے تھے کورونوس کے لڑکے (یونانی دیوتا زیس کا لقب) نے جب ان کی غم گینی کا عالم دیکھا تو اسے رنج ہوا، اس نے اپنا سر ہلایا اور خود سے کہا:

(بے چارے جانور ہم نے تم کو جو لازوال اور لافانی ہو شاہ پیلئس کو کیوں دیا جس کی قسمت میں مرنا لکھا ہے؟ کیا ہم چاہتے تھے کہ تم بھی غمزدہ انسانوں کی طرح دکھ سہو؟ تمام ان مخلوقات میں جو مادر گیتی کے سینے پر سانس لیتے اور رینگتے ہیں، انسان سے زیادہ دردمند کوئی نہیں۔

یہاں پر بادشاہ اور شہزادے، ایک عورت کے اغوا پر ان کی باہمی جنگ، دیوتا اور گھوڑوں کا لافانی ہونا، ہر چیز جن پر ہومر کا پکا عقیدہ تھا، نظر انداز کئے جا سکتے ہیں۔ ہمارے دل و دماغ پر عظیم شاعر کی مرقع نگاری اور جادو بیانی کا جو گہرا اثر اب بھی ہوتا ہے وہ ہے، پہلے تو انسان کے سب سے زیادہ چہیتے پالتو جانور، اس کے دوست اور رفیق گھوڑوں کی وفا شعاری کا یہ مرقع ہمیں تمام حیوانی اور انسانی رفاقت کی قدر و قیمت سے آگاہ کرتا ہے۔شاعر رفاقت کی پاکیزگی اور حسن کے احساس کو غم اور دردمندگی کی آگ میں پگھلا کر ہمارے رگ و پے میں تحلیل کر دیتا ہے۔

ہومر اسی پر اکتفا نہیں کرتا وہ اولمپس پر بیٹھے ہوے دیوتا سے بھی ایک حیرت انگیز بات کہلواتا ہے۔ دیوتا کو اپنے آسمانی گھوڑوں کے دکھ سے دکھ ہوتا ہے، جو فانی انسانوں کے جھگڑوں میں الجھ کر ان سے محبت کرنے لگتے ہیں اور پھر انسانوں کے رنج و غم میں بھی انہیں شریک ہونا ہوتا ہے۔کیا انسان سے بھی زیادہ بدنصیب کوئی مخلوق ہو سکتی ہے؟ وہ کتنا دکھی، کتنا دردمند ہے کہ اس کے پالتو جانور بھی اس کے مصائب اور اندوہ کی آگ میں جلنے سے بچ نہیں پاتے۔شاعر نے اس ایک آخری جملے میں جو اس نے یونانی دیومالا کے قادر مطلق دیوتا زیس کے منہ سے کہلوایا ہے۔ انسانوں کے ان احمقانہ افعال پر کتنا طنز کیا گیا ہے جن کے سبب سے وہ اپنے اوپر مصائب لاتے ہیں۔لیکن ساتھ ہی ساتھ اس نے ان کے ساتھ کتنی گہری ہمدردی کو بھی ابھارا ہے۔

ایک بڑا شاعر انسان اور اس کے حالات کے ساتھ صرف ہمدردی کا اظہار نہیں کرتا بلکہ

وہ اپنی شاعری سے ہمارے دلوں میں ایسا پاکیزہ ہیجان پیدا کرتا ہے، جو ہمیں نوعِ انسانی کے ساتھ مہر و محبت کے رشتوں کو اور بھی استوار کرنے کے لئے آمادہ اور مستعد کر دیتا ہے۔ وہ ہمارے مزاج میں زندگی کے حظ اور حسن کے احساس کو بڑھا کر طبیعتوں میں ایسا گداز اور ایسا کیف پیدا کرتا ہے جو ہمیں صدق و صفا کی جستجو کے لئے آمادہ کرتے ہیں۔ وہ ہمیں ایک لطیف طریقے سے بدل دیتا ہے تا کہ زیادہ حساس اور روشن ضمیر بن کر انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بہتر اور زیادہ طمانیت بخش تنظیم کی سعی اور جدوجہد میں ہماری نظر بلند ہو اور ہمارا قدم راست۔ شاعری کا بزرگ ترین منصب یہی ہے۔

ظاہر ہے کہ رزمیہ اور غنائیہ یا عشقیہ شاعری (ایپک اور لیرک شاعری) میں بہت فرق ہوتا ہے اور یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ ہومر کی رزمیہ سے چند چنی ہوئی مثالیں دے کر ان کا حافظ کی غزلوں سے مقابلہ کرنا بے محل ہے۔ لیکن ان مثالوں کو پیش کرنے کا مقصد ہومر اور حافظ کا مقابلہ کرنا نہیں ہے۔ ان مثالوں کے ذریعے سے صرف یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جب ہم کلاسیکی اساتذہ کی فنی تخلیقات کا مطالعہ کریں اور ان میں سے ان کے 'پیغام' یا ان کے کلام کے بہترین جوہر دریافت کرنے کی کوشش کریں تب ہمیں ان کے عقائد، ان کے زمانے کے محدود علم اور ان کی روایات کے کافی حصے کو نظر انداز کرنا ضروری ہوتا ہے۔

ان چیزوں کی بھی تاریخی اہمیت ہوتی ہے۔ قدیم زمانے کے سماج اور تصورات اور اس زمانے کے طبقاتی یا قومی تضادات وغیرہ کو سمجھنے میں ان سے مدد مل سکتی ہے، لیکن عظیم فن کاروں کی تخلیق میں جو چیز زندہ ہوتی ہے وہ فطرت کے ایسے مظاہر اور انسانوں کے ایسے اعمال، ان کے باہمی تعلقات اور ان سے پیدا ہونے والے تصورات کے تخیلی اور پر جوش موقع ہوتے ہیں جو مرورِ ایام کے باوجود اپنے حسن، سچائی اور حرارت اور اس وجہ سے ہمیں متاثر کرنے کی صلاحیت کو نہیں کھوتے۔

ادبِ عالیہ کی اسی خصوصیت کو بعض مرتبہ 'ابدی قدریں' کہا جاتا ہے، حالانکہ ان کی زندگی اور پائندگی کا سبب یہ ہے کہ گزشتہ چار پانچ ہزار سال میں اگر انسانوں اور اُن کے باہمی تعلقات ان کے تصورات، نظریات، علوم اور ان کی جذباتی کیفیتوں میں بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں تو بہت سی ایسی بھی سچائیاں ہیں جن میں ابھی تک بہت کم تبدیلیاں ہوتی ہیں یا اگر ہوئی بھی ہیں تو سادگی سے زیادہ پیچیدگی کی جانب ہوئی ہیں، یعنی ان کی نوعیت نہیں بدلی ہے۔ اسی وجہ سے یہ

بالکل ممکن ہے کہ تین ہزار سال پہلے کے کسی قبائلی انسان کا برہ کا گیت آج بھی ہمارے لئے جذباتی معنویت رکھے اور ہمیں متاثر کرے۔ لیکن اسی انسان کے سورج دیوتا کی عقیدت میں گائے ہوئے نغمے ہمیں جذباتی طور سے متاثر نہیں کریں گے۔

اسی لئے سائنسی نقطۂ نظر سے اس ادب کو 'ابدی' قدروں کا حامل کہنا غلط ہوگا جو آج بھی ہمارے لئے زندہ ہے۔ لیکن جس کی زیادہ سے زیادہ عمر چار پانچ ہزار سال سے بڑھ کر نہیں ہے، حالانکہ کرۂ ارض پر نوع انسانی کی عمر تین چار لاکھ برس ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ کئی ہزار سال اور گزر جانے کے بعد (لاکھوں برس کا تو ذکر کیا) وہ فنی تخلیقات اس اعتبار سے 'زندہ' رہیں گی یا نہیں کہ وہ انسانوں کو متحرک اور متاثر کریں۔ یقین سے صرف یہی بات کہی جا سکتی ہے کہ ساکت اور ابدی کوئی چیز نہیں ہے، ہر چیز، اور ہر طبیعی، ذہنی، اخلاقی، یا روحانی قدر بدلتی ہے اور نئی اقدار وجود میں آتی رہتی ہیں، لیکن ہر نئی چیز پرانی کے ہی بطن سے پیدا ہوتی ہے اور اپنے اندر نئے پن کے ساتھ پرانی چیز کا خمیر اور اس کے بعض خواص بھی رکھتی ہے۔ یہ سلسلہ یوں ہی جاری ہے اور جاری رہے گا۔

اگر اوپر لکھی ہوئی گذارشات کی روشنی میں ہم خواجہ حافظ کے کلام پر مجموعی نظر ڈالیں۔ اور ان کے پیغامات کو اخذ کرنے کی کوشش کریں، تو ماحصل ظ۔ انصاری کے نتائج سے بالکل مختلف ہوگا۔

(۴)

حافظ پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ اس نے علم و فلسفے کی راہ کو ترک کر دینے کی ترغیب دی ہے اور کہا ہے کہ ان کی مدد سے حقیقت ہم پر آشکار نہیں ہو سکتی۔ بادی النظر میں یہ بات غلط اور ناقابل قبول معلوم ہوتی ہے، لیکن ایسا کرنے کے پہلے ہمیں حافظ کا مفہوم سمجھ لینا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ وہ کس قسم کے علم اور کس طرح کی حکمت کو ناقص تصور کرتا ہے۔

حافظ کو علم و خرد، ہنر و حکمت پر عام اعتراض نہیں ہے۔ وہ خود ایک عالم، ہنرمند اور جفاکش انسان تھا اور اس کے کلام کو پڑھنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے عہد کے ایک خاص قسم کے علما اور ان کی عقل اور ان کی حکمت کو ناکارہ اور گمراہ کن سمجھتا تھا۔ ظ۔ انصاری خود علوم دینیہ کے درس لے چکے ہیں۔ اس لئے وہ جانتے ہیں کہ علما نے علم سے علم دین مراد لے کر اس کی وسعت کو کافی محدود کر دیا تھا۔ صوفیہ حضرات خود اس قسم کے علم کے مخالف تھے۔ چنانچہ سید علی ہجویری داتا گنج، نے 'کشف المحجوب' میں ایک جگہ لکھا ہے:

"پس جو شخص کسی چیز کے معنی اور اس کی حقیقت سے واقف ہو اس کو عارف کہتے ہیں۔ اور جو کوئی صرف عبارت ہی کے یاد کرنے میں مشغول رہے اور اس کے معنی کو نہ یاد کرے اس کو عالم کہتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے لوگ اس گروہ کو خفت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کو دانش مند کہتے ہیں اور عوام اس کو برا مانتے ہیں۔"

(کشف المحجوب مطبوعہ ملک دین محمد، ترجمہ اردو صفحہ ۴۴۹)

اور خود حافظ نے کہا ہے:

حافظ اگر معنی داری بیار
ورنہ دعویٰ نیست غیر از قیل و قال

(حافظ اگر ٹھوس اور بامعنی بات کرنی ہو تو اسے پیش کرو، ورنہ تمہارا دعویٰ صرف زبانی

جمع خرچ ہوگا)

حافظ کے ہی عہد میں نہیں بلکہ کئی صدی پہلے سے تمام دنیائے اسلام کے روشن خیال خردمند اور دانش ور، مولوی کے اس 'علم' کے خلاف ہو چکے تھے۔ اس علم کی دقیانوسیت ظاہر بینی اور سطحی منطق اور پھر اس کی بنیادی دنیاداری یعنی اہل اقتدار اور اہل زر کے ساتھ اس کا اتحاد و اتفاق، عام آزادی خواہ لوگوں کی نظروں میں کھٹکتا تھا۔ حافظ کا حملہ ایسے علم اور اس قسم کے علما پر ہے۔

اس کا ثبوت یہ ہے کہ حافظ نے اپنے زمانے کے فقیہوں، قاضیوں، مفتیوں، مدرسوں، زہاد اور مشائخ پر جتنے سخت اور موثر حملے کئے ہیں کسی دوسرے فارسی یا اردو کے شاعر نے نہیں کئے ہیں۔

اس گروہ کی جس خصلت پر حافظ کو سب سے زیادہ غصہ آتا ہے وہ اس کی ریاکاری تھی۔ یعنی علم دین اور فقہ کا مقدس لبادہ اوڑھ کر اور زہد و عبادت کی نقاب اپنے چہروں پر ڈال کر، یہ حضرات، حافظ کے نزدیک دراصل خود پرستی، خود بینی اور شکم پروری میں غرق تھے اور انہوں نے اپنے علم و حکمت اور تقدس کو عوام الناس کو دھوکہ دینے اور انہیں لوٹنے کا ایک وسیلہ بنالیا تھا[1]۔ حافظ نے کہا یہ حضرات تو:

ریا حلال شمارند و جام بادہ حرام
زہے طریقت و ملت، زہے شریعت و کیش

(ریا کو حلال سمجھتے ہیں اور شراب کے پیالے کو حرام، کیا خوب طریقت و ملت ہے اور کیا خوب شریعت و مذہب ہے)

فقیہہ کی کیفیت یہ ہے کہ ہوش و حواس کی حالت میں وہ عام طور سے ایسی باتیں کرتا ہے جو ٹھیک نہیں ہوتیں۔ یا تو ان میں سچائی نہیں ہوتی یا وہ احمقانہ ہوتی ہیں:

فقیہہ مدرسہ دی مست بود و فتویٰ داد
کہ مئے حرام ولے بہ زمال اوقاف است

(کل مدرسہ کا فقیہہ مست تھا اور اس حالت میں اس نے یہ فتویٰ دے دیا کہ شراب حرام ہے لیکن اوقات کا مال غضب کرنے سے بہتر ہے)

مولانا شبلی اس شعر کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس طرز ادا کی بلاغت پر لحاظ کرو، اول تو اس امر کا اعتراف کہ شراب

گوحرام سہی لیکن مال وقف سے بہرحال اچھی ہے خود فقیہہ کی زبان سے کرایا ہے اس کے ساتھ ہست کی قید لگادی ہے جس سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ فقیہہ سچی بات کا اظہار یوں کاہے کو کرتا، مست تھا اس لئے پس و پیش کا خیال نہ آیا اور جو دل میں تھا زبان سے کہہ گیا" (شعرالعجم۔ جلد دوم صفحہ ۲۲۹)

حافظ کے نزدیک علما عام طور سے جو کچھ کہتے اور لکھتے ہیں وہ لوگوں کو مغالطے میں ڈالنے کے لئے اور سچائی کو چھپانے کے لئے ہوتا ہے۔ لیکن اپنے بارے میں حافظ کا دعویٰ ہے:

رقم مُغلطہ بر دفترِ دانش نہ کشیم
سرِحق باورقِ شعبدہ ملحق نہ کنیم

(میں مغالطے یا شک وشبہ میں ڈالنے والی بات عقل کے کاغذات پر نہ لکھوں گا، اور سچائی کے راز کو شعبدہ کے ورق کے ساتھ ملحق نہ کروں گا۔)

یہاں پر حافظ نے سچے علم اور حق پرستی کو، مغالطہ ڈالنے والوں اور حق کو شعبدہ کے طور پر استعمال کرنے والوں کے علم و دانش سے علیحدہ کرکے دکھایا ہے اور کہا ہے کہ دانش کو مغالطے میں ڈالنے کے اور سچائی کو ذہنی شعبدہ بازی کے لئے استعمال نہ کرنا چاہئے۔ ایذا رسانی اور عام لوگوں کی سادہ اور بے لوث زندگی میں خواہ مخواہ مداخلت اہل تقویٰ کی خود پرستی اور ان کے کبر و غرور کی نشانی ہے۔ حافظ ان کی اس خصلت سے بھی اپنی بیزاری کا اظہار کرتا ہے:

نہ قاضیم، نہ مدرس، نہ محتسب، نہ فقیہہ
مرا چہ کار کہ منع شراب خوارہ کنم

(میں نہ قاضی ہوں نہ مدرس، نہ محتسب ہوں اور نہ فقیہہ، مجھے کیا پڑی ہے کہ میں لوگوں کو شراب پینے سے روکوں؟)

زہد و تقویٰ کی مسلسل تلقین کرنے والوں کو حافظ کم عقل بھی سمجھتا ہے اور دھوکے باز بھی۔ کم عقل اس لئے کہ وہ لوگوں کو خواہ مخواہ ان کی جائز اور بے ضرر خوشیوں سے محروم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور دھوکے باز اس وجہ سے کہ وہ خود تمام وہ باتیں چھپ کر کرتے ہیں جن سے وہ عام لوگوں کو منع کرتے ہیں:

شیخم بہ طنز گفت "حرام است مے مخور"   گفتم "بگو کہ گوش بہ ہر خر نمی کنم"

این تقویم بس است کہ چوں زاہدان شہر ناز و کرشمہ برسر منبر نمی کنم

(شیخ نے طنز کے ساتھ مجھ سے کہا کہ شراب مت پیؤ حرام ہے۔ میں نے کہا ایسی باتیں مجھ سے مت کرو، اس لئے کہ میں ہر گدھے کی بات نہیں سنتا! میرے لئے یہی تقویٰ کافی ہے کہ میں شہر کے زاہدوں کی طرح منبر پر بیٹھ کر (وعظ دیتے وقت) غرور نہیں کرتا اور اپنی آنکھوں اور بھوؤں کو مٹکاتا نہیں ہوں!)

حافظ دینی امور میں حکم لگانے والوں اور دنیوی معاملات میں فیصلہ اور سزا دینے والوں کے اخلاق پر جب نظر ڈالتا ہے تو اسے ان دونوں گروہوں میں ایک بات مشترک نظر آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ دونوں جھوٹے اور فریبی ہیں:

مئے خور کہ شیخ و حافظ و مفتی و محتسب چوں نیک، بنگری ہمہ تزویری کنند

(شراب پیؤ! اس لئے کہ شیخ اور حافظ، مفتی اور محتسب، اگر اچھی طرح دیکھو تو سب کے سب جھوٹے اور مکار ہیں)

ایک دوسرے شعر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حافظ کی حقیقت بین نظر اپنے معاشرے میں اہل حکم کے ساتھ دینی رہنماؤں کے ارتباط اور رشتے کو بخوبی دیکھتی تھی۔ حافظ کو معلوم تھا کہ موخر الذکر گروہ اپنی مبیّنہ روحانیت کی قوت اور زہد و تقویٰ کی تعلیم و تلقین کو دراصل امرا کے اقتدار کو مضبوط کرنے اور خود اپنے لئے ان کے دسترخوان سے مادی رعایتیں اور نعمتیں حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ حافظ نے کہا:

زاہد شہر چو مہر مَلِک و شحنہ گزید
من اگر مہر نگارے بگزینم چہ شود

(جب شہر کے زاہد نے اپنے لئے بادشاہ اور کوتوال کے ساتھ دوستی کرنا پسند کر لیا ہے، تو پھر اگر میں ایک حسین معشوق سے محبت کرنے کا فیصلہ کر لوں تو کیا ہرج ہے؟)

یہ کہا گیا ہے کہ اس قسم کا سخت طنز اور استہزا ایک منفی رویّہ ہے، اس سے محض عام بیزاری اور اپنے ماحول سے فرار کا جذبہ ظاہر ہوتا ہے۔ حافظ سماج کی خرابیوں پر نکتہ چینی تو کرتا ہے لیکن ان خرابیوں سے نجات کی راہ جو بتاتا ہے وہ دراصل ان خرابیوں سے آنکھیں موڑ کر یا تو جذب و وجد و کرامات کی اندرونی اور داخلی دنیا کی راہ ہے یا پھر 'عیش پرستی' اور 'لذت کوشی' کی راہ اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں راہیں ناقص ہیں۔

راقم حروف کے نزدیک حافظ پر یہ اعتراض بھی صحیح نہیں ہے۔ حافظ کا غالب رجحان داخلیت اور عیش پرستی کی جانب ان معنوں میں نہیں ہے جن معنوں میں ظ۔ انصاری صاحب نے اصطلاحوں کو استعمال کیا ہے۔

حواشی:

ا۔ امام غزالی نے احیاء العلوم میں اہل علم اور زہاد کی ریاکاری اور خود پرستی کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے، مولانا شبلی نے اپنی کتاب 'امام غزالی' میں امام صاحب کی کتاب سے اقتباس کرتے ہوئے لکھا ہے:

''انسان کو اپنے افعال و اعمال کی نسبت سب سے زیادہ دھوکا وہاں ہوتا ہے جہاں پر بظاہر مذہبی رنگ چڑھا ہوتا ہے۔ وہ ایک کام کو مذہبی نیکی سمجھ کر کرتا ہے لیکن تہ میں کوئی اور چیز ہوتی ہے اسے 'دم الغرور' کہا ہے'' ص ۱۳۵

اور آگے چل کر ریا کی تین قسمیں لکھیں ہیں۔ عبادت گذار جن کا شکار ہو جاتے ہیں:

ریاء جلی: مثلاً ایک شخص لوگوں کو دکھانے کے لئے عبادت کرتا ہے۔

ریاء خفی: مثلاً ایک شخص عام طور سے تنہائی میں عبادت کرتا ہے لیکن جب کوئی مہمان آتا ہے تو ادائے عبادت میں زیادہ دل لگاتا ہے۔

ریا اخفی: مثلاً ایک شخص دکھلانے کے لئے عبادت نہیں کرتا، نہ کسی کے آنے سے حالت میں فرق آتا ہے لیکن جب لوگوں کو اس کی عبادت گزاری کی اطلاع ہوتی ہے تو آپ سے آپ اسے خوشی ہوتی۔

(۵)

آج کل فکر و نظر میں سب سے اہم اور بڑی پہچان عینیت کے ماورائی فلسفے کی تردید اور طبعی، جدلیاتی طرز فکر کی روشنی میں کائنات و فطرت کے اصول اور انسانی معاشرے کے ارتقا کے قوانین کو دیکھنا، سمجھا جاتا ہے۔ اس کے باوجود ہم موجودہ زمانے میں بھی یہ دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ جو عینیت کے نظریے کو کسی نہ کسی شکل میں قبول کرتے ہیں، اپنی طبقاتی حیثیت کے تجربے سے یا فطرت اور زندگی کے کسی پہلو کے حقیقی مشاہدے سے عینیت کے خول میں رہتے ہوئے بھی عملی طور پر بڑی حد تک ترقی پسند ہوتے ہیں۔ یہ فکری تضاد، خود موجودہ طبقہ وسماج کے تضادات سے پیدا ہوتا ہے۔ جس میں مختلف نظریے اور عقائد، نئے جمہوری اور علمی اور قدیم اور فرسودہ نظریوں کے ساتھ باقی رہتے ہیں۔ چنانچہ آج کل بہت سے اُن ادیبوں میں جن کے عقائد روایتی ہیں، ہمیں روشن خیالی کے پہلو نظر آجاتے ہیں اور کئی ترقی پسند ایسے ہیں جو نادانستہ ایسے افکار کا اظہار کرتے ہیں جن میں رجعتی رجحانات ہوتے ہیں۔

جب دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کا آفتاب لبِ بام ہے اور اس کے ایک بڑے حصے میں اجتماعی نظام قائم ہو رہا ہے، اور سماجی حقائق اور معاشرت کے علاقوں اور رشتوں کے باریک تار موٹی نظر رکھنے والوں کے سامنے دہکتے اور چمکتے ہوئے دکھائی دے سکتے ہیں، ایسے میں بھی اوہام کی تاریکیاں کروڑوں دماغوں پر مسلط ہیں، تو پھر ایسے زمانے میں جب جاگیری نظام ایشیا کے سارے خطے پر مسلط تھا اور تاریخی اعتبار سے اس کی جگہ لینے کے لئے کسی بہتر معاشرت کا قیام ممکن ہی نہ تھا، عینی فلسفوں اور عقائد اور نظریۂ حیات کے ایک ہمہ گیر خول کا موجود ہونا لازمی تھا۔ اس زمانے کے بڑے سے بڑے حقیقت پرست اور جید سے جید حکیم یا سائنس داں بھی افلاطونی یا نوافلاطونی، عینی فلسفہ سے کسی نہ کسی شکل میں متاثر تھے۔ خود حکیم بوعلی سینا جس نے اپنی سائنسی اور طبعی تحقیقات اور فلسفے سے مادی نقطۂ نظر کو مضبوط کیا، اس خول کو پوری طرح سے توڑ نہیں سکا تھا۔ وہ تمام مظاہر فطرت کے قوانین کو ایک دوسرے سے منسلک سمجھتا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ یہ

سمجھنا غلط ہے کہ یہ قوانین بعض اوقات الوہی مداخلت سے توڑ دیۓ جاتے ہیں۔لیکن ان تمام قوانین واصول کا مخرج وہ ذات الٰہی کو سمجھتا تھا۔

جس فلسفہ کو تصوف کا نام دیا جاتا ہے (چاہے وہ 'فعالی' ہو یا 'انفعالی') وہ ازمنہ وسطیٰ میں چین ؒ، ہندوستان اور تمام اسلامی اور مسیحی دنیا کا غالب نظریۂ حیات رہ چکا ہے لیکن اگر اس پر تفصیلی اور گہری نظر ڈالی جائے تو ہمیں نظر آتا ہے کہ تصوف (جو ہندوستان میں ویدانت اور یورپ میں مسٹیزم کی شکل میں موجود تھا) کے اندر بے شمار اختلافات ہیں۔مثلاً وہ لوگ بھی جو تصوف کے بنیادی نظریے وحدتِ وجود کو اتحاد و زندقہ کہتے ہیں اور اس کی متعین کی ہوئی ریاضتوں اور ترک دنیا اور ترک ذات کے سلسلے میں انتہا پسند رویے کو غیر شرعی اور غیر اسلامی سمجھتے ہیں، صوفی کہلائے جاتے ہیں۔منصور حلاج بھی صوفی ہیں، اور شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی) جو وحدت وجود کو سختی سے مسترد کرتے ہیں وہ بھی۔علامہ اقبال تصوف کے سب سے بڑے اسلامی مفکر شیخ محی الدین ابن عربی کی اہم ترین تصنیف 'فصوص الحکم' کے متعلق فرماتے ہیں۔

"جہاں تک مجھے معلوم ہے 'فصوص' سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں"

اور ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوف کا وجود سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے"ؒ

لیکن وہی علامہ اقبال جب 'اصلی' اسلامی فکر و نظر کی تجدید کے لئے کمربستہ ہوتے ہیں تو دنیائے اسلام بلکہ پروفیسر نکلسن کے قول کے مطابق ساری دنیا کے سب سے عظیم صوفی شاعر مولانا جلال الدین رومی کو اپنا مرشد بناتے ہیں اور اعلیٰ علین کی سیر ان کی ہی رہنمائی میں کرتے ہیں۔(جاوید نامہ)

چنانچہ بہتر ہے کہ ہم جب دور وسطیٰ کے کسی مفکر، خاص طور پر کسی شاعر کی فکر کا تجزیہ کریں تو اس کے یہاں تصوف کی اصطلاحات اور صوفیانہ طرز خیال کو ہی دیکھ کر اس پر زندگی سے فرار کے نظریہ کے پیرو یا رجعتی ہونے کا حکم نہ لگا دیں۔ضرورت اسکی ہے کہ ہم بالتفصیل اسکے کلام کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ آیا واقعی اس کا مجموعی تاثر منفی اور فراری ہے یا یہ کہ بعض ایسے پہلوؤں کے باوجود جدید طبعی اور معاشرتی علوم کی روشنی میں ہمیں قابل قبول نہیں ہیں۔اس مفکر یا شاعر نے اپنے زمانے کے حقائق اور ان کے حسن و قبح کو اس طرح سے دیکھا اور سمجھا ہے، جس سے ہمارے

موجودہ شعور میں اضافہ ہوتا ہے، جو ہمارے دل میں پاکیزہ اور لطیف کیف وانبساط پیدا کر کے اور ہماری تہذیب دماغ کے ذریعے سے، زندگی سے ہماری دلچسپی کو بڑھاتا ہے اور ہماری روح کو عہد حیات میں حصہ لینے کے لئے زیادہ متوازن اور مستند کرتا ہے۔

حافظ تصوف کے اس عام عقیدے کو قبول کرتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ ہی حقیقت مطلق اور حسن مطلق ہے جو تمام کائنات میں جاری وساری ہے۔ کائنات کی تخلیق کے پہلے دن (روز اول) اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات میں سے انسان کو ہی اپنے بار امانت سے سرفراز کیا[۲]۔ انسان تمام کائنات میں افضل ترین ہے اس لئے کہ روز اول اس کے علاوہ سب نے محبت کے اس عظیم پیمان کو اٹھانے سے اپنی معذوری ظاہر کی تھی[۵]۔ حافظ بعض دوسرے صوفیا کی طرح اس عقیدے سے ایک ہمہ گیر محبت کا نظریہ اخذ کرتا ہے۔ اس کے نزدیک چونکہ تمام دوسرے مظاہر فطرت اور انسان یعنی تصوف کی اصطلاح میں تمام مجازی مظاہرات، فی الحقیقت اللہ یا حسنِ ازلی اور حقیقت ابدی کا ہی پرتو ہیں (جو ان تمام میں اس طرح موجود ہے جس طرح جسم میں جان) اس لئے تمام مخلوق خدا سے محبت، اللہ سے ہی محبت کرنے کا دوسرا نام ہے۔ خلق خدا کی خدمت ہی بہترین عبادت ہے[۶]۔ یہی تصور حافظ کو اس نتیجے پر بھی پہنچاتا ہے کہ دنیا کو اسلام اور کفر، یعنی دو ایسے حصوں میں تقسیم کر دینا جن میں سے ایک کو روشنی اور دوسرے کو تاریکی کا خطہ سمجھا جائے، غلط ہے۔ اللہ کا جلوہ جب ہر جگہ اور ہر چیز میں ہے تو کعبہ اور بت خانے میں فرق کیسے ہوسکتا ہے؟

در عشق خانقاہ و خرابات شرط نیست
ہر جا کہ ہست، پرتوے روئے حبیب ہست

(عشق میں خانقاہ اور خرابات (شراب خانے) کی شرط نہیں ہے، جو بھی جگہ ہے وہاں حبیب (اللہ) کے ہی چہرے کی روشنی ہے)

پھر کہا ہے:

در خراباتِ مغاں نور خدا می بینم
ویں عجب بیں کہ چہ نوری ز کجا می بینم

(خرابات مغاں میں میں خدا کا نور دیکھتا ہوں، کیسے تعجب کی بات ہے کہ کیسا نور مجھے کہاں سے نظر آرہا ہے)

اس طرح حافظ عشق ومحبت کو تمام کائنات کے وجود وارتقا کا محرک اور بنیادی اصول

سمجھتا ہے اور نوع انسانی کو اس کا امین سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک مودّت کا یہ جذبہ ہی انسانی سرشت کا سب سے قیمتی اور لطیف جوہر ہے جو آب و گل کی اس تعمیر میں تمام اخلاقی اور روحانی خوبیاں پیدا کرتا ہے۔

دوش دیدم کہ ملائک در میخانہ زدند
گل آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند

(کل میں نے دیکھا کہ فرشتے میخانۂ (عشق) کا دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے اور وہاں وہ آدم کی مٹی گوندھ کر اس سے جام شراب بنا رہے تھے)

انسان کی سرشت میں محبت کا وجود اللہ کی ودیعت اور امانت ہے۔ یہ ایک نعمت ہے جس کی فراوانی اور پہنائی انسان کو اس کی تمام پستیوں سے اونچا کر کے خیر و برکت کی طرف لے جاتی ہے۔

عشق و محبت کے اس الوہی، مابعدالطبیعاتی ماخذ کو قبول کرنے کے بعد، اور اس الوہی اصول کو تمام موجودات میں کارفرما تسلیم کرنے کے بعد (وحدتِ وجود کا عقیدہ) جو صوفیا کے اکثر گروہوں کا عقیدہ تھا، حافظ کے سامنے کئی راستے کھلے ہوئے تھے۔ ایک تو ترک دنیا اور ترکِ لذات کا راہبانہ راستہ، یعنی نفس اور شہوانی خواہشات کے ساتھ صوفی درویشوں کی طرح 'مجاہدہ' کر کے نفس کشی اور اس طرح 'اندرونی' پاکیزگی پیدا کر کے، معرفت الٰہی حاصل کرنا اور بالآخر فنافی اللہ ہو جانا۔ صحیح معنوں میں اس قسم کے تصوف کو 'انفعالی تصوف' کہا جا سکتا ہے۔

حافظ طریقت کو اس طرح مسترد کرتا ہے، جس طرح علما ظاہر کی بتائی ہوئی راہ کو اس نے ناقابل قبول سمجھ کر اس کا مذاق اڑایا۔ اس نے جس طرح علما ظاہر کے علم کی سطحیت اور ان کی اخلاقی پستی پر نکتہ چینی کی اسی شدت کے ساتھ اس نے اپنے زمانے کے خرقہ پوشوں اور تارک دنیا صوفیوں پر طنز و استہزا کے تیر و نشتر چلائے اور ان کے طریقے کو غلط اور گمراہ کن بتایا:

حافظ ایں خرقہ بینداز مگر جان بہ بری
کاتش از خرمنِ سالوس و کرامت برخاست

(حافظ اس خرقے (صوفی درویشوں کا لبادہ) کو پھینک دے شاید جان بچ جائے، اس لئے کہ فریب اور کرامت کے کھلیان سے آگ بھڑک اٹھی ہے)

حافظ کے کلام میں صوفی درویشوں کا خرقہ یا دلق کا بار بار ذکر آتا ہے اور اسے ہر جگہ

فریب، دورنگی اور ریاکاری کی علامت بتایا گیا ہے، اسی طرح درویشوں کی خانقاہیں اور صومعے، زندگی سے فرار کی پناہ گاہوں اور عیوب کے مرکزوں کے نشان کے طور پر پیش کیے گئے ہیں: صوفی کو مخاطب کر کے خواجہ حافظ کہتے ہیں:

در سماع آئی و ز سر خرقہ برانداز و برقص
ورنہ در گوشہ نشین، دلقِ را در برگیر

(مست ہو کر گانا سنو، اور اپنی گدڑی اتار پھینکو اور رقص کرو! اگر ایسا نہیں کرتے تو اپنے گوشے میں بیٹھے ریائی کے لبادے سے چمٹے رہو)

خواجہ صاحب صوفیوں کی پاکبازی اور معرفت کے دعوؤں کو ناقابل اعتنا سمجھتے ہیں:

خیز! تا خرقۂ صوفی بہ خرابتا بریم
زرق و طامات بازار خرافات بریم

(اٹھو تاکہ صوفی کے لبادے کو شراب خانے میں اور (اس کے) مکر اور شیخی کو خرافات کے بازار میں لے چلیں)

حافظ نے اپنے زمانے کے صوفیا کی ہر ایک عادت و خصلت کا گہرا مطالعہ کر کے ان کی ریاضت و زہد، ان کے وعظ و پند یہاں تک کہ ان کے لباس اور ان کے کھانے پینے تک کے انداز پر نکتہ چینی کی اور ان کا مذاق اڑایا۔ یہ ایک مشہور بات ہے کہ صوفی اور زاہد کھانے پینے کے معاملے میں کافی حریص ہوتے ہیں وہ بہت زیادہ اور بُری طرح کھاتے ہیں۔ حافظ نے ان کی اس خصلت کو یوں بیان کیا ہے۔

صوفی شہر بیں کہ چوں، لقمۂ شبہہ می خورد
بال و دمش دراز باد، ایں حیوانِ خوش علف

(ہمارے شہر کے صوفی کو تو ذرا دیکھو کہ (گھوڑے کے) چارہ کا لقمہ کس طرح کھاتا ہے! خدا اس کے بال اور دم کو دراز کرے، کیسا اچھا چارہ کھانے والا حیوان ہے!)

جن خیالات کا اظہار متذکرہ بالا اشعار میں کیا گیا ہے، ان کو حافظ نے بار بار اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے اور یہ اس کی امتیازی خصوصیات میں سے ہے۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خیالات اس کی اساسی فکر کا ایک حصہ ہیں۔

ایسی صورت میں یہ کہنا کہ حافظ اس قسم کی داخلیت کا معتقد تھا جس پر اس کے عہد کے

بیشتر صوفیا کا عمل تھا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ حافظ مدرسوں میں حاصل کیئے ہوئے علم (جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں) اور خانقاہ کے زہد و ریاضت دونوں کو دریافت حقیقت کا غلط طریقہ سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک معاشرتی زندگی میں اپنے ہوش و حواس، عقل و احساسات کو پوری طرح بروئے کار لا کر اور زندگی کا تجربہ حاصل کر کے ہی انسان کو معرفت حق حاصل ہو سکتی ہے اور وہ طمانیت قلب حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے کہا ہے:

ز کنجِ مدرسہ حافظ مجوئی گوہر عشق

قدم بردن بہ اگر میلِ جستجو داری

(حافظ گوہر عشق کو کنجِ مدرسہ میں مت تلاش کر، اگر تجھے جستجو کی تمنا ہے تو مدرسہ سے باہر قدم رکھ)

اور مدرسے اور خانقاہ سے باہر نکلنے کے بعد وہ زندگی میں، علم کی بنیاد پر عمل کا مطالبہ کرتا ہے، رنج و ملال سے بچنے کا یہی طریقہ ہے:

نہ من زِبی عملی درجہاں ملولم و بس

ملامت علما ہم زعلم بے عمل است

(اکیلا میں ہی نہیں ہوں جو دنیا میں بے عملی کی وجہ سے ملول ہوں، علما کی ملامت بھی اسی وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ عالم بے عمل ہیں)

حافظ کس قسم کی زندگی اور معاشرت کو لائق تحسین سمجھتا ہے؟ حافظ کے دیوان کے بیشتر حصے میں اس سوال کا نہایت صاف اور واضح جواب مل جاتا ہے۔ حافظ کی شاعری کے وہ پہلو بھی جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے (علمائے ظاہر اور صوفیائے باطن پر ان کی نکتہ چینی) زندگی کے متعلق اس کے مثبت اور ایجابی نقطۂ نظر کے ایک جزو کی حیثیت سے ہی اگر دیکھے جائیں، تب ان کی صحیح اہمیت سمجھی جا سکتی ہے اور اس لحاظ سے انہیں منفی نقطۂ نظر کہنا غالباً ٹھیک نہیں ہوگا۔

حواشی:

ا۔ نوافلاطونیت، اسکندریہ کے ایک فلسی فلاطینس سے منسوب ہے۔ فلاطینس ۲۰۴ء سے ۲۷۰ء تک زندہ رہا۔ اس کی کتاب 'آئیناذ' کا عربی میں ترجمہ ہوا اور اس نے عربی اور ایرانی تصوف کے فلسفے

پراور دوسری طرف عیسائی اور یورپی فلسفیوں پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ اپنے کو افلاطون کا مقلد کہتا تھا۔

۲۔ چین میں متصوفانہ نظریات کا مبلغ لاوتسے تھا۔ اس کے خیالات اس کی کتاب 'تاوتے کنگ' میں قلم بند ہیں۔

۳۔ علامہ اقبال کے خطوط کے یہ اقتباسات میں نے سید علی عباس جلال پوری کے ایک مقالے سے لئے ہیں جو رسالہ 'نقوش' لاہور (مارچ ۵۴) میں شائع ہوا ہے۔ افسوس ہے کہ میرے پاس علامہ کے خطوط کا مجموعہ فی الحال نہیں ہے کہ ان کی تصدیق کر لیتا۔ امید ہے کہ یہ اقتباسات صحیح ہوں گے۔

۴۔ صوفیوں نے یہ عقیدہ قرآن کریم کی اس آیت سے اخذ کیا ہے: وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِن بَنِي آدَمَ مِن ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ شَهِدْنَا (سورۃ الاعراف آیت ۱۷۲)

(اور جب لیا تیرے پروردگار نے آدم کے بیٹوں سے ان کی پٹھوں سے ان کی اولاد کو گواہ کیا ان کو ان کی باتوں پر کیا نہیں ہوں میں تمہارا رب؟ انہوں نے کہا البتہ تو ہے۔ شاہد ہوئے ہم)

۵۔ اور یہ عقیدہ اس آیت سے اخذ کیا گیا ہے:

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا

(تحقیق کہ پیش کیا تھا ہم نے امانت کو اوپر آسمانوں کے اور زمین کے اور پہاڑوں کے۔ پس انکار کیا سب نے اس کے اٹھانے سے اور اٹھا لیا اس کو انسان نے تحقیق وہ تھا بے باک نادان)
سورۃ الاحزاب، آیت ۷۲

۶۔ شیخ سعدی کے مشہور اشعار ہیں:

طریقت بجز خدمت خلق نیست
به تسبیح و سجادہ و دلق نیست

تو بر تختِ سلطانی خویش باش
به اخلاقِ پاکیزہ درویش باش

بصدق و ارادت میاں بستہ دار
زطامات و دعویٰ زباں بستہ دار

قدم باید اندر طریقت نہ دم
کہ اصلی نہ دارد دمی بے قدم

بزرگان کہ نقد صفا داشتند
چنیں صرقہ زیرِ قبا داشتند

(۶)

حافظ کی شاعری کا مرکزی نکتہ انسان کی طبعیاتی، حیاتی، دنیاوی زندگی ہے جسے وہ حسن ولطافت، خلوص اور پاکیزگی، ہنرمندی اور آسودگی عشق اور محبت سے لبریز دیکھنا چاہتا ہے حافظ اپنے معاشرے کی انفرادی اور اجتماعی حیات سے اپنی شاعری کا آغاز کرتا ہے۔ وہ اسی زندگی میں اور اس کے اردگرد پھیلے ہوئے فطری مظاہر میں حسن کی جستجو کرتا ہے۔ انسانوں کے جسم میں، ان کے رہن سہن، ان کے اعمال حرکات اور ان کے باہمی خلوت وجلوت کے رشتوں میں۔

حافظ کے نزدیک وہ قوت اور تحریک جو انسانوں کو اخلاقی، روحانی اور حیاتی طور سے سرور وانبساط بخشتی ہے۔ اور اس طرح ان کے باہمی تعلقات کو حسین اور پرلطف بناتی ہے، محبت و اُنس ہے۔ وہ محبت اور رفاقت کی فراوانی اور شدّت کا مطالبہ کرتا ہے۔ تمام وہ چیزیں، ادارے افراد اور اخلاقی وفلسفیانہ تصورات اور عقیدے جو شعلۂ عشق کی حدّت کو کم کرتے ہیں جو انسان سے انسان کی رفاقت کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں یا اسے منغض اور آلودہ کرتے ہیں حافظ کے نزدیک قبیح اور مذموم ہیں۔ زہاد اور تارکِ دنیا صوفی، طماع علما اور ایذا رساں محتسب خود پرست اربابِ اختیار اور ممسکِ امرا اور اس گروہ کے عائد کیے ہوئے سخت گیر احکامات اور ریاکارانہ اخلاقی اصول اور قوانین، جو معمولی انسانوں کو ان کی معمولی خوشیوں اور آسودگیوں سے محروم کرتے ہیں۔ حافظ ان کا مخالف ہے اور لوگوں سے کہتا ہے کہ اگر وہ آزاد اور خوش رہنا چاہتے ہیں تو مذکورہ بالا گروہ کے ناروا احکامات اور ان کی عائد کی ہوئی چند در چند پابندیوں کو ہرگز قبول نہ کریں۔

اس کے برخلاف تمام وہ چیزیں اور حالات جو محبت ومودّت میں اضافہ کرتے ہیں، جن سے حیات اور ان سے حاصل ہونے والی لذتوں کی پاکیزہ اور حسین تکمیل ہوتی ہے جو انسانی تعلقات میں لطف وسرور پیدا کرتے ہیں حافظ ان کا پرجوش حامی اور طرفدار ہے۔

حافظ کے کلام میں شراب اور میخانہ، پیرمغاں اور ساقی، عشق ومحبت کے جذبے کو ابھارنے، احساس حسن اور نشاطِ حیات کو تیز کرنے اور بڑھانے کے وسیلے ہیں۔ حافظ انسان کو بے

کیف، سطحی، ریا کارانہ، بے مقصد اور حیوانوں کی طرح پابند اور خود پرستانہ شعور کے نور سے عاری زندگی کی چہار دیواری سے باہر کھینچ کر زیادہ آزاد، زیادہ متوازن اور مسرت سے بھری ہوئی رنگین فضاؤں میں لے جانا چاہتا ہے۔

برگ گلِ خوش رنگ، اور موسم بہار کی عطر بیز ہوائیں، درختوں پر نئے نکلے ہوئے سبز پتے، صوتِ ہزار اور رقص سرو، سر بہ سجود بنفشہ اور لالے کے ارغوانی جام، نرگس کی چشم نگراں اور سوسن کی زباں، حافظ انہیں اور فطرت کے تمام دلکش مظاہر کو زندگی کے اس انبساط و لطف کا پیغامبر اور شریک بناتا ہے جس کا وہ متلاشی ہے۔

رات کو شمع فانوس کے گرد حریفانِ 'نیک نام' اور ہم نشینانِ 'نیک کردار' کی مجلسِ انس' برپا ہوتی ہے۔ ساقی شکر دہان بادہ گلرنگ کے یاقوتی جام پیش کرتا ہے اور دلبر کی زلف معنبر دلوں کو اپنا شکار بنالیتی ہے، ایسے میں بزم گاہ قصر فردوس معلوم ہوتی ہے اور اس کا گلشن روضۂ دار السلام اور حافظ بے ساختہ کہتا ہے:

ہر کہ ایں صحبت بجوید خوشدلی بردے حلال
وانکہ ایں عشرت نہ خواہد زندگی بردے حرام

(جو کوئی ایسی صحبت کی تلاش کرے خوشدلی (مسرت) اس پر حلال ہو، اور جو اس عشرت کو نہ چاہے زندگی اس پر حرام ہو!)

حافظ کی بیشتر شاعری محبت اور امید، خوشی اور حسن کا ایک ایسا کیف آور اور پر سحر نغمہ ہے جس کے ذریعے سے اس نے انسانوں کی زندگی میں 'خوشدلی' پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اور اس طرح ان کے سرمایۂ مسرت میں اضافہ کیا ہے۔ حافظ کی شاعرانہ عظمت یہ ہے کہ اس نے محض ایک نکتۂ نظر پیش کر کے زندگی کی تنقید ہی نہیں کی اور زندگی کو ایک خاص طریقے سے بسر کرنے کی ترغیب ہی نہیں دی، بلکہ جس نظریہ اور زندگی کے اسلوب کا وہ پیغامبر تھا۔ اس کے کلام میں اس زندگی کا رس اور اس کا آہنگ اس طرح رچا اور بسا ہوا ہے کہ پڑھنے والے کے حسیات میں وہی شیریں اصوات، وہی نغمے اور ان کے سُر گونجنے لگتے ہیں۔

حافظ اپنے شبستان کیف و سرور میں جو شمعیں جلاتا ہے وہ ہماری روح میں یک بیک جگمگا اٹھتی ہیں پھولوں کی پنکھڑیوں کی نزاکت و نکہت، بہار کی ہواؤں کے پر امید جان پروری اور آب رکنا باد کی خنک تسکین سے حافظ ہمارے جسم و جان کو جیسے معطر اور شاداب کر دیتا ہے۔

حافظ کو اس کا بخوبی احساس اور علم تھا کہ اس کی شاعری کا سب سے اہم منصب یہی ہے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اس منصب میں پوری طرح کامیاب ہے:

زنظمِ دلکش حافظ چکید آبِ حیات
چنا کہ خوئے شدہ جانان چکان ازان عارض

(حافظ کی دلکش نظم سے آب حیات ٹپکا، جس طرح محبوب جب پسینے سے بھیگ جائے تو اس کے گال پر سے قطرے ٹپکیں)

حافظ کے نزدیک اس کی نظم میں زندگی کو جاوداں کرنے کی صلاحیت ہے۔ اگر یہاں پر شاعرانہ تعلّی سے درگزر کیا جائے تو کم از کم یہ بات تو صاف ہے کہ شاعری کا مقصد خود حافظ کے نزدیک زندگی سے گریز یا فرار نہیں تھا بلکہ زندگی پیدا کرنا اور برقرار رکھنا، مردہ دلوں میں جان ڈالنا، حیات کو تازہ، مسرور اور مزین کرنا تھا۔

اسی موضوع کو اس نے ایک دوسرے شعر میں یوں بیان کیا ہے:

کسی گیرد خط در نظم حافظ
کہ ہیچش لطف در گوہر نباشد

(نظم حافظ میں وہی شخص خرابی نکال سکتا ہے، جو ایک موتی سے بالکل لطف اندوز نہیں ہوتا)

ایک سچے موتی کی خوبی اس کی آب وتاب، اس کی دلکش سفیدی اور پاکیزگی، اس کی نازکی اور سڈول پن ہوتا ہے۔ حافظ کہتا ہے کہ اگر کوئی شخص ایسا ہے جو ایسے حسن سے متاثر نہیں ہوتا اور اس کے نزدیک ان خوبیوں اور لطافتوں کے کوئی معنی نہیں اگر اس کی زندگی اور اس کے احساسات میں اس مثالی اور کامل حسن کی تخلیق سے کوئی فرق، کوئی بہتر تبدیلی نہیں پیدا ہوتی، تو پھر حافظ کی نظم بھی اس کے لئے بے معنی اور بے اثر ہوگی۔

اوپر یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ خواجہ حافظ اپنے عہد کے فقہا و زہاد کے بتائے ہوئے متشرع راستے کو اختیار نہیں کرتا، وہ مشائخ اور صوفیا کے ترک دنیا اور گوشہ نشینی کے طریقے کو بھی مسترد کرتا ہے اور نیز یہ کہتا ہے کہ امرا اور اہل اقتدار کے ساتھ مل کر یہ سب انسان کو اس کی جائز خوشیوں سے محروم کرتے ہیں۔ وہ ان سب کو زرق ونفاق، طامات وسالوس، ناز وکرشمے کا مجرم ٹھہراتا ہے۔ اس کے بجائے انسانوں کو عشق ومحبت اور پاکیزہ حیاتی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کے نزدیک فطرت کا یہی تقاضہ ہے اور خوشی کی کامیاب زندگی

بسر کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ اس موقع پر معترضین یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ یہ راہ عیش پرستی اور لذت کوشی کی راہ ہے اور یہ بھی فی الحقیقت زندگی سے فرار ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حافظ زندگی کے ٹھوس حقائق اور ان کے تقاضوں کو جام شراب میں ڈبو کر انہیں محو کر دینا چاہتا ہے۔

حافظ پر یہ اعتراض بھی میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ حافظ بنیادی طور پر (جیسا کہ کہا گیا ہے) انسان کی حیاتی اور جذباتی لذات کو تیز اور گہرا اور لطیف بنا کر ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کو مسرور اور دلچسپ اور حسین بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی نظم ایک ایسا سدابہار، معطر، رنگین اور شاداب باغ ہے، جس کی مجموعی فضا، جس کی نہروں کی روانی اور جس کے آبشاروں کی آواز، جس کے پھولوں کی تازگی اور مہک، اور جس کے درختوں کے ٹھنڈے سائے، انسان کے مجروح دل اور تھکے ہوئے جسم کو تر و تازہ کر کے اس کی روح کو پاک اور مصفا کرتے ہیں اور اسے تجدید حیات کا پیغام دیتے ہیں یعنی حافظ اپنے اس باغ کے حسن پر والہانہ طور سے فدا ہے۔ اسے اس کے ایک ایک سبز پتے، اور اس کے پھولوں کی ہر ایک نازک پنکھڑی سے عشق ہے اور وہ اسے زندگی کی محبوب ترین نعمت سمجھتا ہے۔ کس کو اس کا حق ہے کہ ایسے اچھے اور نادر روزگار مالی پر اعتراض کرے اور یہ کہے کہ ساری دنیا ایک باغ تو نہیں ہے، اس باغ کے باہر ایک ہُو کا عالم ہے، وہاں تو گرم ہوائیں چلتی ہیں، انسانیت کو خاک اور دھول پھانکنی پڑتی ہے، اور وہاں باہر بہت سے ایسے ہیں جن کو بے رحم زندگی نے اس کا موقع تک نہیں دیا ہے کہ تمہارے لگائے ہوئے ان پھولوں اور ان سبزہ زاروں اور تمہاری جاری کی ہوئی ان سیمیں نہروں کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھ سکیں۔

کوئی مغنی جب اپنے فن میں ڈوب کر، اپنی اور سامعین کی طرب انگیزی اور نشاط کے لئے راگ کے شعلے بھڑکائے تو اس پر یہ اعتراض غلط ہے کہ زندگی محض ایک نغمہ نہیں ہے۔ البتہ اگر وہ اس پر مصر ہو کہ ہم زندگی کے دوسرے آہنگوں کو دوسرے اوقات میں نہ سنیں یا اس کا نغمہ ایسی تاثیر رکھتا ہو جو ہمیں زندگی سے بیزار یا مایوس کر کے ہم میں اکتاہٹ اور مردنی پیدا کر دے پھر ہم اس پر بجا طور پر معترض ہو سکتے ہیں اور اس راگ کو سننے سے انکار کر دینا ہمارے لئے صحیح ہوگا۔

شعر حافظ نہ تو ایسا اثر رکھتا ہے اور نہ وہ ہمیں زندگی کے دوسرے آہنگوں سے بے خبر کرتا ہے۔ اس کا نغمہ حیات پرور اور جاں بخش ہے اور وہ ایک ہی سُر ہر وقت اور ہر جگہ نہیں الاپتا۔ اس کا راگ زندگی کے مختلف سُروں سے مل کر بنا ہے۔

(۷)

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حافظ نے کس قسم کے عیش اور کس طرح کی لذت حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے۔ یہاں پر غالباً اس بات کو صاف کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ انسانی حیات سے لذت حاصل کرنا یا عشق و محبت کے جذبات سے لطف اندوز ہونے کی خواہش کوئی ناپسندیدہ اور بری چیز نہیں ہے؛ گو دنیا میں کافی عرصے سے ایسے ادارے اور افراد چلے آئے ہیں جنہوں نے ترکِ لذات اور نفس کشی کو، یہاں تک کہ خود اپنے جسم کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچانے اور دوسروں کو اس کی ترغیب دینے یا اس پر مجبور کرنے کو روحانی فضیلت کا طریقہ بتایا ہے۔

مجہول قسم کے اخلاق کے نام پر نوعِ انسانی نے اس قسم کے بہت سے مصائب سہے ہیں اور خود کو خواہ مخواہ بہت سی پاک اور بے ضرر خوشیوں اور مسرّتوں سے محروم کیا ہے۔ اس قسم کی ایذا رسانی صرف جسمانی اور حیاتی ہی نہیں، بلکہ ذہنی اور روحانی بھی ہوتی ہے۔ جب بہت سے افعال کو جو نہ فرد اور نہ جماعت کے لئے مضرت رساں ہوتے ہیں گناہ قرار دے دیا جاتا ہے اور اچھے خاصے، جیتے جاگتے انسان انہیں کر کے، گناہ کی عقوبت کے خوف سے اپنی بے آزار زندگیوں کو غمناک اور مضطرب بنا لیتے ہیں، گناہ کے اس تصور اور ایذا رسانی کے اس رجحان کے اسباب معاشرتی اور طبقاتی حالات اور ان سے پیدا ہونے والی ایک خاص قسم کی نفسیاتی کیفیت میں پنہاں ہیں، جن کے بیان کا یہ موقع نہیں ہے۔

یہاں پر صرف یہ اشارہ کرنا مقصود ہے کہ بعض روشن خیال افراد بھی ایسے لوگ جو اس نفس کش اور ایذا رساں طریقۂ فکر کو شعوری طور پر مسترد کرتے ہیں، عیش کوشی، طرب انگیزی، لذّت اندوزی اور اس قسم کے کلموں کو برے معنوں میں استعمال کرنے لگے ہیں۔ مثلاً اگر انہیں کسی بورژوا ادیب کے جنسی غلاظت، فحاشی یا غیر صحت مندانہ رجحانات پر نکتہ چینی کرنا ہوگی (بالکل جائز اور بجا طور پر) تو وہ کہتے ہیں کہ وہ 'لذتیت' کی ترغیب دیتا ہے گویا جنسی یا اور کوئی لذّت اور اسے حاصل کرنے کی کوشش فی نفسہٖ بری چیز ہے۔ حالانکہ ان نقادوں کا مقصد جنسی یا دوسری حیاتی

لذتوں کی برائی کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس ادیب کے ہاتھوں اس کی گراوٹ اور ابتذال پر احتجاج کرنا ہوتا ہے۔

اگر ہم اس نکتے کو مدنظر رکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حافظ نے جس عیش کوشی اور لذّت اندوزی کی تبلیغ کی ہے، اس میں اتنی پاکی اور صفائی، حسن اور خلوص ہے جس سے زندگی کو چار چاند لگتے ہیں؛ جو زندگی سے فرار نہیں ہے بلکہ اسے مزیّن کرتے اور مہذب بناتے ہیں۔

تہذیب آخر کس چیز کا نام ہے؟ یہی کہ انسان اپنے معاشرے میں اپنی تخلیقی قوتوں کو یوں فروغ دیں جس سے نہ صرف ان کی ابتدائی ضرورتیں پوری ہوں (کھانا، پہننا، مکان میں رہنا فطری آفات سے بچنا وغیرہ) اور ان کی جبلتیں (جنس، بھوک) اس طریقے سے منظم کی جائیں کہ ان کے ذریعے سے جسمانی آسودگی اور نوع انسانی کی بقا ہو، بلکہ تخلیقی قوتوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان کے شعور میں علم کی روشنی بڑھے اور ان کے جذبات اور روح کا تزکیہ ہو۔ اس طرح مادّی ترقی کے ساتھ ان کا جذباتی اور روحانی ارتقا بھی ہوتا ہے، آسودگی اور مسرّت کے احساسات زیادہ لطیف اور زیادہ گہرے ہوتے جاتے ہیں، اور انسان تہذیب کے زینے پر نیچے سے اوپر کی طرف قدم رکھتے ہیں۔

شعر حافظ کا بیشتر حصہ عاشقانہ ہے، اور میرے خیال میں اس کے متعلق بلاخوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ عشق و محبت کے جذبے اور اس کی واردات کو فارسی اور اردو تو خیر، شاید دنیا کی بہت سی زبانوں میں ایسی والہانہ سرخوشی، ایسی لطافت و شیرینی، اتنے خلوص و خوبصورتی کے ساتھ کسی بھی شاعر نے اتنے اچھے اور پر اثر طریقے سے بیان نہیں کیا ہے۔

حافظ کا تقریباً سارا دیوان غزل اس دعوے کا ثبوت ہے۔ اس میں زیادہ اور کم اچھی غزلیں زیادہ اور کم اچھے شعر ضرور ہیں۔ لیکن فارسی اور اردو کے اساتذہ میں غالباً کوئی ایسا نہیں جس کے یہاں خوبیوں کی اتنی افراط ہے کہ اس کے دیوان اور غزلوں سے انتخاب کرنا اتنا زیادہ مشکل ہو جتنا کہ حافظ کے دیوان غزل سے انتخاب۔ اس کے خزانے میں جواہر اتنے بکثرت ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں کی دعوت اپنے اندر اتنی کشش رکھتی ہے کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کسے چن لیا جائے اور کسے چھوڑ دیا جائے۔

بہت سی غزلیں مسلسل نظمیں ہیں، اور اگر واقعاتی نہیں تو ان میں ایک کیفیاتی تسلسل ہے، معنی اور کیفیت، الفاظ کی صوتی ہم آہنگی اور ترنم کے ساتھ مجذوب ہیں۔ تخیل کی رنگینی اور

ندرت خیال کی صفائی اور سچائی کے ساتھ منڈھی ہوئی ہے۔ حافظ کی تخئیل ایک متحرک تخئیل ہے۔ اس کے یہاں نغمگی اور حسن، نظم کے متوازن اور مناسب الفاظ اور ان کی صحیح ترتیب سے ہی نہیں پیدا ہوتی بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ خود ان الفاظ کے ذریعہ سے ادا ہونے والا خیال اپنے اندر حرکت، حرارت اور ترنم رکھتا ہے۔ ایک مصرعے کے بعد دوسرا مصرع اور غزل کے ایک شعر کے بعد دوسرا شعر ایک نورانی اور رخشندہ پیکر کی طرح، ہر گھڑی تال اور سم کے ساتھ کوئی دل نواز ادا، کوئی انوکھا حسین پہلو دکھاتا ہوا، سارے پیکر کی مجموعی دلکشی کا راز رفتہ رفتہ کھولتا جاتا ہے یہاں تک کہ فریفتگی اور ارتباط کی فضا چاروں طرف سے جیسے ہمیں گھیر لیتی ہے اور انبساط و حسن کا رقص ہماری رگوں میں بہتے ہوئے خون کے ایک ایک قطرے میں ہونے لگتا ہے۔

مثال کے طور پر اس مشہور غزل کو دیکھیے:

یارب آن شمعِ شب و روزِ کاشانۂ کیست — جان ماسوخت بپرسید کہ جانانۂ کیست؟

بادۂ لعلِ لبش، کز لب ما دور مباد — راحِ روحِ کہ و پیمان دہ پیمانۂ کیست؟

دولتِ صحبت آں شمع سعادت پرتو — باز پرسید خدا را کہ بہ پروانۂ کیست؟

می دہد ہر کسش افسونی و معلوم نشد — کہ دل نازک او، مائل افسانۂ کیست؟

یارب آن شاہ وش، ماہِ رخ زہرہ جبیں — در یکتائی کہ و گوہر یک دانۂ کیست؟

آن مۓ لعل کہ ناخوردہ مرا کردہ خراب — ہمنشین کہ دہم کاسۂ و پیمانۂ کیست؟

گفتم ''آہ! از دلِ دیوانۂ حافظ بی تو''

زیرلب خندہ زنان گفت کہ ''دیوانۂ کیست؟''

اے خدا راتوں کو اجالا کر دینے والی وہ شمع کس کے کاشانے کی ہے؟ اس نے میری جان کو جلا ڈالا ذرا پوچھو تو سہی کہ وہ کس کی محبوب ہے؟

اس کے لب لعل کی شراب، کہ خدا اسے میرے ہونٹوں سے دور نہ رکھے، کس کی روح کی راحت اور کس کے پیمانے کا پیمان ہے۔

اس شمع سعادت پرتو صحبت کی دولت، خدا کے لئے ذرا پھر تو دریافت کرو کس پروانے کے لئے ہے؟

ہر شخص اس کا افسوں پھونکتا ہے، لیکن یہ نہ معلوم ہوا کہ اس کا نازک دل کس کے افسانے کی طرف مائل ہے؟

اے خدا! وہ جو شاہانہ حسن رکھتی ہے، جس کا چہرہ چاند کا سا اور جس کی

پیشانی زہرہ جیسی ہے، وہ کس کی دریکتا اور کس کی انمول موتی ہے؟
میں نے اس کے سرخ ہونٹوں کی شراب نہیں پی، لیکن اس نے مجھے
مدہوش کردیا، وہ کس کی ہم نشیں اور کس کی ہم کاسۂ ہم پیمانہ ہے؟
جب میں نے کہا کہ "ہائے بیچارے حافظ کا دل تیرے بغیر" تو اس نے
زیرلب مسکرا کر پوچھا: "وہ آخر کس کا دیوانہ ہے؟"

(اس ترجمے کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔ اس میں اس غزل کی حیرت انگیز نغمگی اور ترنم اور اس کے الفاظ کی موزونیت، شیرینی اور روانی کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ تاہم ان صاحبوں کے لئے جو فارسی سے کم واقف ہیں شاید اس سے کسی قدر سہولت ہو)

اس غزل میں شاعر نے اپنے محبوب کے حسن اور دلآویزی کے مختلف پہلوؤں کی وہ تصویر پیش کی ہے جو ایک چاہنے والے کے دل میں محبت کے آغاز میں مرتسم ہوتی ہے۔ یہاں ہمیں محبت کرنے والے کے مختلف النوع جذبات اور تاثرات ایک دوسرے میں تحلیل نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے محبوب کے حسن کی روشنی اور حرارت اور دلکشی سے متاثر ہوکر اسے 'شمع شب افروز' کہتا ہے اس کے لبوں میں لعل کی سی سرخی اور رنگینی ہے اور ان میں شراب کی سی کیفیت ہے۔ اس کی صحبت سعادت کی دولت ہے۔ اس میں چاند اور ستاروں کی سی تابانی اور نورافشانی ہے۔ لیکن حسن کی یہی فراوانی جو عاشق میں کیف و مسرت کا طوفان برپا کرتی ہے، اسے سخت اضطراب میں بھی مبتلا کرتی ہے۔ ابھی تو وہ اپنے محبوب سے اچھی طرح واقف بھی نہیں۔ وہ ہے کون؟ وہ کس کا شانے کی شمع ہے؟ وہ کس کی روح کو کیف و سرور بخشتی ہے؟ اس کا جادو تو معلوم ہوتا ہے ہر شخص پر چل گیا ہے اور سب اس کا دم بھرتے ہیں لیکن وہ؟ وہ ان میں کس کی طرف مائل ہے؟ حسن کی یہ طلسماتی جاذبیت اور محبت کی یہ پرکیف سرخوشی ایک طرف، اور غیر یقینی حالات سے پیدا ہونے والا اضطرار دوسری طرف، نظم کے ہر مصرعے میں مدوجزر پیدا کرتا ہوا، اور انبساط و اضطراب کی پے درپے لہریں اٹھاتا ہوا، ایک سیلاب کی طرح بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ مقطع میں آکر اس دل پذیر کشمکش کی بے حد حسین تصویر، ایک شعر کے اندر ساری اس کیفیت کو جیسے بند کر کے پیش کردیتی ہے جو اوپر کے تمام اشعار میں ظاہر کی گئی ہے۔ محبوبہ اپنے عاشق میں کسی قدر دلچسپی کا اظہار تو کرتی ہے، اس کے تجاہل عارفانہ، اس کی زیرلب ہنسی سے وہ اضطراب کچھ تو کم ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن شاعر ہمیں انجام سے مطلع نہیں کرتا۔ اور اسی مقام پر محبوبہ کی شیریں ہنسی کی آواز اور اس کے معنی خیز سوال پر، نظم ختم ہوجاتی ہے۔

موجودہ بحث میں حافظ کے کلام کی تمام نمایاں خصوصیتوں اور خوبیوں کا بیان ہمارا مقصود نہیں ہے۔ ورنہ صرف اسی غزل کے بارے میں بہت کچھ اور کہا جا سکتا ہے۔ یہاں ہم صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ محبت کے اس سچے، سریلے اور حسین نغمے کو، یا اسی طرح کے دوسرے نغموں کو جو دیوان حافظ کا بیشتر مایہ ہیں زندگی سے فرار، یا عیش پرستی (اس کے برے اور مبتذل معنوں میں) تلقین نہیں کہا جا سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ حافظ نے بعض مقامات پر یہ بھی کہا ہے کہ چونکہ یہ دنیا فانی ہے اور 'حاصل کون و مکاں' ہیچ ہے، اس لئے انسانوں کو جتنی بھی مہلت ملے ان کو خوش و خرم رہ کر، انسانوں سے دوستی اور محبت کر کے، صلح کل، کم آزاری، اور نیکی میں بسر کرنا چاہئے۔ مجھے امید ہے کہ حافظ کی محبت سے بھری اس نیکی کی زندگی پر کسی کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ رہ گیا دنیا کو ہیچ سمجھنے کا مسئلہ تو اس فلسفے کو قبول کرنا ہمارے لئے ضروری نہیں ہے۔

میرا خیال ہے کہ حافظ نے جہاں پر اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ زیادہ تر رسمی اور روایتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے اس نے بعض بادشاہوں اور امرا کی مدح سرائی کی ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ چاہئے کہ ایک ایسا شاعر جو اپنی شاعری میں زندگی کے لطیف ترین جذبات، محبت و عشق، دوستی اور فطرت کے حسین مناظر و مظاہر کو اپنی شاعری کی اساس بناتا ہے، اور جو یہ کہتا ہے کہ انسان اپنے حسیات اور جذبات کی پاکیزہ اور حسین تسکین اور آسودگی کے ذریعے سے ہی پر مسرت اور بھرپور زندگی بسر کر سکتے ہیں، وہ زندگی کا شاعر ہے یا زندگی سے فرار کا مبلغ؟ اپنے زمانے کے بعض روایتی خیالات و عقائد کا اگر وہ اظہار بھی کرتا ہے، لیکن انہیں مرکزی حیثیت نہیں دیتا، اور مجموعی طور سے ان عوامل و محرکات کا مغنّی ہے جو ہماری انفرادی اور معاشری زندگی میں ان جذبات کو ابھارتے ہیں جن سے زندگی بارآور ہوتی اور سنورتی ہے تب اس تضاد کے باوجود (جو اپنے طبقہ اور سماج کے ہر فنکار، ادیب، فلسفی اور شاعر میں ہمیں ملے گا) ہمیں اس کی فنکارانہ عظمت کے اس حقیقی پہلو کو اس کے رسمی اور غلط پہلوؤں سے الگ کر کے دیکھنا چاہئے۔ بغیر اس طریقے پر چلے ہوئے گزشتہ زمانے کے فنون لطیفہ اور افکار کی تخلیقات کو نہ تو ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور نہ ان سے مستفید اور محظوظ ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو اپنے ماضی کی بیشتر فنی تخلیقات سے ہم اپنے کو منقطع کر لیں گے اور اس طرح ہم اپنی سب سے بڑی اور قیمتی روحانی اور تہذیبی دولت کو اپنی کم فہمی کے سبب بیکار بنا دیں گے اور ایسا کرنے سے خود ہمارے جدید جمہوری اور انسان پرور ادب اور فن کا مضبوط اور بھرپور ارتقا ناممکن ہو جائے گا۔

(۸)

حافظ کی عشقیہ شاعری کی ایک ممتاز خصوصیت اس کی پاکیز گی ہے[1]۔ یہاں پاکیزہ محبت سے مراد وہ محبت نہیں ہے جسے افلاطونی عشق کہا جاتا ہے اور جہاں 'پاکیزگی' محبت کی جنسی اور جسمانی نوعیت سے بالکل منقطع ہونے کے بعد محض ایک ذہنی ریاکاری بن جاتی ہے۔ ایسا عشق حافظ کے یہاں نہیں ملتا۔ حافظ اپنے خلوص، اپنی محبت کی جذباتی اور نفسیاتی سچائی اور اس کی گہری انسانیت سے پاکیزگی کی فضا پیدا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے:

صبح دولت می دمد کو جام ہمچون آفتاب	فرصتے زین بہ کجا باشد، بدہ جام شراب
خانہ بی تشویش و ساقی یار و مطرب بذلہ گو	موسم عیش است و دور ساغر و عہد شباب
شاہد و ساقی بدست افشاں و مطرب پائے کوب	غمزۂ ساقی ز چشم مے پرستاں بردہ خواب
خلوتِ خاص است و جائے امن و نزہت گاہ انس	ایں کہ می بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب

یہاں حافظ اپنی خلوت خاص میں ہے، عہد شباب ہے اور دور ساغر۔ شاہد مطرب کے نغمے اور رقص، اور ساقی کے ناز وغمزے نے مے پرستوں کی آنکھوں سے نیند اڑا دی ہے لیکن عیش کی اس محفل کو جب حافظ 'خانہ بے تشویش' اور 'جائے امن' کہتا ہے، ساقی کے 'یار' اور مطرب کے 'بذلہ گو' ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے اور نغمے، رقص اور سرور کے اس تمام ساز وسامان کو 'نزہت گاہ انس' سے تعبیر کرتا ہے، تو کیا وہ یہ واضح حالات کے سبب سے اپنی شہوت و ہوس کی جبلتوں کو بے لگام چھوڑ دیتا ہے۔ ایسے شخص کو نہ تو اپنی اور نہ دوسرے کی انسانی عزت و شرافت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے جسم و جان پر ڈاکے مارتا ہے تاکہ اپنے جہنمی نفس کو تسکین دے سکے۔ جس عشق و محبت اور جس قسم کی رندی اور عیش کی حافظ نے تلقین کی ہے اور جس کے نغمے اس نے گائے ہیں اسے اس قسم کے روحانی اور جسمانی ابتذال اور سفلگی سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ حافظ انسان کے حسیات اور اس کی روح کی تہذیب و تشریف کا پیغامبر ہے؛ اور یہ دوسرے عیش

پرست اس کے تنزل اور ردالت کے۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

حافظ کو ضرور اس کا احساس رہا ہوگا کہ اس پر دوسمت سے حملے ہوں گے، ایک تارکِ دنیا زُہاد اور صوفیوں کی جانب سے جو کلیۃً حیاتی لذات کے ترک کو انسان کی نجات کا واحد ذریعہ بتاتے تھے، لیکن حافظ جنہیں ریاکار سمجھتا تھا؛ اور دوسرے سفلہ اور رذیل عیش پرستوں کی جانب سے جو عشق و محبت میں طہارت اور پاکیزگی کے تصور کو ہی سمجھنے سے قاصر تھے۔ چنانچہ اسی قسم کے بداندیشوں کو شاید ذہن میں رکھ کر اس نے کہا ہوگا۔

کرا رسد کہ کند عیب دامنِ پاکت
کہ ہمچو قطرہ کہ بر برگِ گل رسد، پاکی

(کس کا منہ ہے کہ تیرے پاک دامن کی برائی کرے؟ تو تو اس قطرے کی طرح پاک ہے جو گلاب کی پنکھڑی پر ٹپکتا ہے!)

حواشی:

ا۔ حافظ نے ایک جگہ عشق کو 'فن شریف' کہا ہے:

عشق می ورزم و امید کہ این فنِ شریف چوں ہنر ہاے دگر موجب حرمان نہ شود

(۹)

محبت کے زمزمہ سنج حافظ کی نظر محدود نہیں ہے۔ اگر اس میں نشاطِ حیات کا جوش ہے اور وہ انسانوں کو زندگی کے ایک ایک لمحے اور فطرت کے ہر ایک رنگین مظاہرے سے اپنے جسم اور روح کو شادماں اور پرنور کرنے کی ترغیب دیتا ہے تو دوسری طرف اس کی حقیقت بیں نظر اپنے معاشرے کی ان خرابیوں پر بھی پڑتی ہے جو بیشتر اچھے اور ایمان دار انسانوں کی زندگیوں کو محرومیوں اور مایوسیوں سے بھر دیتی ہے۔

حافظ نے اپنے زمانے کے سماج میں ظلم اور بے انصافی اور انسانی تعلقات میں خلق و مودّت کی کمی کا بار بار اتنی سچائی اور دردمندی سے ذکر کیا ہے کہ اس کے ان مضامین کے اشعار صدیوں سے زبان زدِ عوام ہو گئے ہیں۔ چونکہ وہ سماجی حالات جو معاشرت میں یہ نزاع اور انحطاط پیدا کرتے ہیں، بہت سی جگہوں پر صدیاں گزرنے کے بعد بھی باقی رہے ہیں، اس لئے وہ ایک زندہ سچائی کے حامل معلوم ہوتے ہیں۔ حافظ کی یہ مشہور نظم اس کی سب سے اچھی مثال ہے:

ایں چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم — ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شر می بینم
ہر کسی روز بہی می طلبد از ایام — مشکل این است کہ ہر روز بتر می بینم
ابلہان را ہمہ شربت ز گلاب و قند است — قوتِ دانا ہمہ از خونِ جگر می بینم
اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالان — طوق زرّین ہمہ در گردن خر می بینم
دختران را ہمہ جنگ است وجدل با مادر — پسران را ہمہ بدخواہ پدر می بینم
ہیچ رحمی نہ برادر بہ برادر دارد — ہیچ شفقت نہ پدر را بہ پسر می بینم
پندِ حافظ بشنو خواجہ برو نیکی کن — زآنکہ ایں پند بہ از دُر و گہر می بینم

(زمانے میں یہ کیسا ہنگامہ ہے کہ میں ساری دنیا کو فتنے اور فساد سے بھری ہوئی دیکھتا ہوں۔ ہر شخص چاہتا تو یہ ہے کہ بہتر دن آئیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ دن بدن حالات بدتر ہوتے جاتے ہیں۔ جو بے وقوف ہیں ان

کے لئے تو ہر وقت گلاب اور قند کا شربت مہیا ہے، لیکن جو دانا ہیں ان کی
غذا صرف خونِ جگر ہے۔ تازی گھوڑا تو پالان کے نیچے مجروح ہوگیا ہے
لیکن جتنے گدھے ہیں اُن کی گردنوں میں سنہرے طوق ہیں۔ لڑکیاں اپنی
ماں سے صرف لڑنا بھڑنا جانتی ہیں، اور لڑکے محض اپنے باپ کی بدخواہی
میں مشغول ہیں۔ بھائی بھائی کے ساتھ مرحمت سے بالکل پیش نہیں
آتا اور باپ اپنے لڑکے کے ساتھ شفقت نہیں کرتا۔ حافظ کی نصیحت
سنوار جا کر (ایک دوسرے کے ساتھ) نیکی کرو اس لئے کہ یہ نصیحت
ہیرے اور موتی سے زیادہ قیمتی ہے!)

ان اشعار میں معاشرتی زوال کے دو پہلوؤں کو خاص طور سے نمایاں کیا گیا ہے۔

پہلے تو یہ دکھایا گیا ہے کہ جن لوگوں کے پاس اتنی دولت ہے کہ وہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرسکیں (قند اور گلاب کے شربت پئیں اور زرتار کپڑے پہنیں) وہ فی الحقیقت اس کے مستحق نہیں ہیں۔ حافظ کے لفظوں میں امرا اور اہل اقتدار کا گروہ قیمتی وردیاں پہنے ہوئے گدھوں کا گروہ ہے۔ وہ نااہل اور کم عقل ہیں اس کے برخلاف وہ لوگ جو ہنرمند اور سمجھ دار ہیں ان کو ان کے واجبی رزق اور حقوق سے محروم کردیا گیا ہے۔ ظلم و محن کا بھاری طوق ان کی گردنوں میں پڑا ہوا ہے اور وہ مجروح ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ حافظ ظالموں اور احمقوں کے اور ہنروروں اور مظلوموں کے ان دو گروہوں میں سے کس کا طرفدار ہے۔

آخری دو شعروں میں حافظ نے اخلاقی پستی کی ایک عبرت ناک تصویر کھینچی ہے۔ والدین اور ان کی اولاد کی باہمی محبت اور شفقت، بھائیوں کی ایک دوسرے کے ساتھ مودّت و ارادت، انسانی تعلقات کی سب سے سنہری کڑیاں اور تہذیب کی لطیف ترین علامتیں ہیں لیکن جب یہ سنہری کڑیاں بھی، سماجی فساد اور شر کی وجہ سے ٹوٹنے لگیں تو پھر بھلا دوسرے انسانی رشتے کس طرح برقرار رہ سکتے ہیں؟

انسانی معاشرت باہمی تعاون اور ہمدردی کے رشتوں سے جس قدر زیادہ بندھے گی، اتنا ہی زیادہ اس میں خیر و خوبی کی افزائش ہوگی۔ اتنا ہی زیادہ اس کی مادی اور ذہنی تخلیقات میں اضافہ ہوگا اور انسانیت، تہذیب اور مدنیت کی راہ پر آگے بڑھے گی۔

لیکن جب معاشرت کی یہ حالت ہو کہ اس کی بنیادی وحدت یعنی خاندان کے اندر اتنا

تناؤ اور جھگڑا پیدا ہو جائے کہ بزرگوں اور خوردوں، والدین اور ان کی اولاد کے مابین فطری محبت تک کے رشتے پراگندہ ہونے لگیں۔ پھر یہ اس کی علامت ہے کہ وہ معاشرت تمدّن کی بلندیوں سے بربریت کی پستیوں کی جانب کھسک رہی ہے۔ حافظ اس سماجی خطرے کو محسوس کرتا ہے اور مقطع میں اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جب تک انسان اپنے تعلقات کی بنیاد ایک دوسرے کے ساتھ نیکی اور بھلائی کرنے پر نہیں رکھیں گے، حالات بہتر نہیں ہو سکتے۔

حافظ کے اس سماجی شعور کا اظہار صرف مذکورہ بالا نظم میں ہی نہیں ہوا ہے۔ اس کے کلام میں بار بار اس کا اظہار ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں حافظ سماجی زندگی کے تین پہلوؤں کو خاص طور پر نمایاں کرتا ہے۔

اول تو وہ صاحب اقتدار امرا اور ان کے مقرر کیے ہوئے عاملوں (مثلاً قاضی، شحنہ، محتسب) کے ناروا اعمال ان کی بداخلاقی اور ان کی جہالت کی سخت مذمت کرتا ہے۔

دوسرے وہ اپنے عہد کے بیشتر علما، فقہا، زہاد اور مشائخ کے علم و زہد اور حقیقت شناسی کے دعوؤں کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ بار بار کہتا ہے کہ زہد وریا ہم معنی ہو گئے ہیں (اس کی تفصیل ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔)

تیسرے، حافظ اپنے زمانے میں اہل ہنر کی تباہ حالی کی شکایت کرتا ہے۔ اس کے اشعار سے اس کا صاف اظہار ہوتا ہے کہ وہ اہل ہنر کو معاشرت کا قابل ترین رکن سمجھتا ہے اور اہل ثروت واقتدار کے ہاتھوں سے اسے ان کی ناقدری کا سخت رنج ہے۔

اس زمانے کے بہت سے علما و فضلا کی طرح حافظ کا تعلق بھی اپنے ملک فارس کے شاہی دربار سے تھا۔ شیراز میں حافظ کے دورانِ حیات میں چار بادشاہوں کی حکمرانی ہوئی (ابو اسحاق، محمد ابن منظر مبازر الدین، شاہ شجاع اور شاہ منصور) ان سب کے یہاں حافظ کی رسائی تھی، حافظ نے اپنی زندگی ہی میں اتنی عظیم شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی تھی کہ بنگال اور دکن سے لے کر سمر قند اور بغداد اور شام تک جہاں بھی فارسی کا رواج تھا، ان کا طوطی بولتا تھا۔ یہ مصدقہ بات ہے کہ بغداد، دکن اور بنگال کے بادشاہوں نے ان کو اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی لیکن وہ شیراز چھوڑ کر کہیں نہیں گئے:

نمی دہند اجازت مرا بہ سیر و سفر
نسیم باد مصلّےٰ و آب رکن آباد

بد قسمتی سے حافظ کی زندگی کے حالات ہمیں زیادہ معلوم نہیں ہیں۔ صرف چند ہی باتیں ان کے متعلق یقین سے کہی جا سکتی ہیں۔ وہ ایک تاجر کے بیٹے تھے لیکن بچپن میں ہی ان کے والد کا انتقال ہو گیا، اور ان کا لڑکپن اور جوانی کافی تکلیف اور افلاس میں بسر ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق اس زمانے میں وہ ایک نانبائی کی دوکان پر ملازم تھے جہاں انہیں سخت جسمانی مشقت کرنا ہوتی تھی۔ انہوں نے اسی حالت میں تعلیم حاصل کی اور ان کے کلام سے ظاہر ہے کہ وہ حافظ قرآن ہونے کے علاوہ علوم متداولہ پر بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔

شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کرنے کے بعد ان کی معاشی حالت ضرور بہتر ہوئی ہوگی، گو انہوں نے بارہا اس کی شکایت کی ہے کہ محبت کرنے کے لئے بھی دولت درکار ہے اور وہ ان کے پاس نہیں۔ ان کے کلام کو دیکھ کر ہمارے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ان کی ادبی زندگی جفاکشی کی زندگی رہی ہوگی حافظ کی سی فنکارانہ تخلیق سخت عرق ریزی کا ہی نتیجہ ہو سکتی ہے۔ ان کی غزلوں کا ایک ایک مصرع اپنی صفائی، فصاحت اور صناعی میں موتی کی طرح ڈھلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

ان کے کلام سے یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ اپنے کو 'ہنرمند' طبقے کا ایک فرد سمجھتے تھے۔ وہ متاہل تھے اور اپنے بیوی بچوں سے انہیں محبت تھی شیراز کے سب سے مقتدر اہل علم و ادب ان کے دوستوں میں تھے۔ بہر صورت ان کی معتد بہ[1] اور باکمال ادبی تخلیق اس کا ثبوت ہے کہ وہ اوباشی یا بیکاری کی زندگی بسر کرنے والے آدمی نہیں تھے۔

بادشاہت، عمّال سلطنت اور امرا کی جانب حافظ کا رویہ وہی تھا جو جاگیری عہد کے سب سے زیادہ روشن خیال انسان کی فلاح اور آزادی چاہنے والے اور اپنے وطن و قوم سے محبت کرنے والے دانشوروں کا عام طور سے تھا۔ ان کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کسی ایسے سیاسی یا معاشی نظام کا تصور کر سکیں جس میں بادشاہ یا امرا ہوں گے لیکن اس دائرے میں رہتے ہوئے وہ ایک ایسے نظام کے خواہش مند تھے جس میں بادشاہ داد و عدل کا منبع ہو تاجروں، ہنرمندوں اور دوسرے محنت کرنے والے طبقوں کو شخصی آزادی ہو، حکمران، ان کی فلاح و بہبود کی پیہم تدابیر اختیار کریں اور ان کو اندرونی دراز دستیوں اور بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ رکھیں۔ مغرور، عیش پرست اور خلائق پر سختیاں کرنے والے بادشاہوں، امرا اور عمّال کی یہ روشن خیال دانشور نکتہ چینی کرتے تھے۔ شیخ سعدی کی گلستاں و بوستاں کا ایک بڑا حصہ اس صنف کے ادب کی بہترین مثالوں میں

سے ہے۔ خواجہ اس معاملے میں بالکل ان کے ہی نقش قدم پر چلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ حافظ نے بادشاہوں سے کہا ہے کہ ان کے لئے سب سے بڑی عبادت اور اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ وہ خلق خدا کے ساتھ انصاف کرے۔

شاہ را بہ بود از طاعتِ صد سالۂ زُہد
قدرِ یک ساعت عمری کہ در او داد کند

(بادشاہ کے لئے وہ ایک ساعت جس میں وہ انصاف کرتا ہے اس کی سو سال کی زاہدانہ عبادت سے زیادہ قیمتی ہے)

اہل اقتدار عام طور سے یہ سمجھتے ہیں کہ لباس واطوار میں بھڑک اور شان پیدا کر کے وہ لوگوں کو مرعوب کرسکیں گے۔ لیکن حافظ اشارہ کرتا ہے کہ یہ سب ظاہری طمطراق ہے اور ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ فی الحقیقت وہ لوگ جن کی عام انسان قدر کرتے ہیں اور جن کی بات مانی جاتی ہے اپنے اندر دوسری انسانی خوبیاں رکھتے ہیں۔

نہ ہر کہ چہرہ بر افروخت دلبری داند
نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند
نہ ہر کہ طرفِ کُلہ کج نہاد و تند نشست
کلاہ داری و آئین سروری داند

(ہر وہ شخص جو اپنے چہرے کو چمکاتا ہے، دلبری نہیں جانتا، ہر وہ شخص جو آئینہ بناتا ہے سکندری نہیں جانتا، اور ہر وہ شخص جو کلاہ کو سر پر ٹیڑھی رکھتا ہے اور اکڑ کر بیٹھتا ہے بزرگی اور سرداری کے اصول سے واقف نہیں ہوتا)

متمرد اہل حکم کو حافظ یاد دلاتا ہے کہ ان کا انجام عبرت ناک ہوگا:

بگذر زِ کبر وناز کہ دیدہ است روزگار چینِ قبائے قیصر وطرفِ کلاہِ کے

(غرور اور ناز چھوڑ دو، اس لئے کہ زمانہ دیکھ چکا ہے کہ قیصر کی قبا کی شکن اور کیخسرو کی کلاہ کی کجی کا کیا حشر ہوا)

حافظ سکندر کا نام لے کر تمام بادشاہوں سے کہتا ہے کہ امارت اور مطلق العنانی کے بل پر وہ زندگی کا بہترین جوہر حاصل نہیں کرسکتے۔ انسانیت کی معراج کے لئے دوسری صفتوں کا پیدا کرنا ضروری ہے:

اے سکندر بنشین وغم بیہودہ مخور کہ نہ بخشند ترا آب حیات از شاہی!

(اے سکندر بیٹھ جا اور بیکار کا رنج مت اٹھا، بادشاہ ہونے کی وجہ سے تجھے آب حیات نہیں بخش دیا جائے گا۔)

جہاں تک اپنے زمانے کے دوسرے حکام کا تعلق ہے (مثلاً قاضی، شحنہ، مفتی، میر عسس، محتسب) حافظ ان کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتا۔ ان تمام عہدیداروں کا فرض قانون وشریعت کے مطابق ملک میں عدل وانصاف کرنا، لوگوں اور حکومت کے حقوق وفرائض کی پابندی کروانا ہے۔ لیکن جب حافظ کو یہ نظر آتا ہے کہ عدلیہ کے حکام (قاضی اور مفتی) انصاف نہیں کرتے، شحنہ اور عسس چوروں اور ڈاکوؤں کو پکڑنے کے بجائے الٹے ان کے ساتھ مل کر عوام کو ستاتے ہیں اور محتسب جس کا کام یہ ہے کہ دیکھے کہ لوگ شرع کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ اپنے عہدے سے فائدہ اٹھاتا ہے اور خود وہ تمام غیر شرعی حرکتیں چھپ کر کرتا ہے جن کے کرنے پر وہ دوسروں کو سزا دیتا ہے، تو پھر حافظ کا صبر کا پیمانہ جیسے چھلک جاتا ہے اور وہ اس سارے گروہ سے اپنی سخت بیزاری کا اظہار کرتا ہے اتنے دلچسپ طریقے سے جو صرف اسی کا حصہ ہے:

باده با محتسب شهر ننوشی حافظ
که خورد باده ات و سنگ بجام اندازد

(حافظ شہر کے محتسب کے ساتھ شراب مت پی۔ وہ تیری شراب بھی پیتا ہے اور پھر جام شراب پر پتھر بھی مارتا ہے)

محتسب کا کام لوگوں کو شراب پینے سے روکنا ہے۔ اس شعر میں یہ دکھایا گیا ہے کہ جب اسے موقع ملتا ہے اور مفت کی ملتی ہے تو وہ چپکے سے حافظ کے سامنے بیٹھ کر شراب پی لیتا ہے۔ اس حرکت سے اس کی ریاکاری اور حرص دونوں کا اظہار ہوتا ہے۔ معاملہ یہیں پر ختم ہو جاتا تب بھی غنیمت تھا۔ حافظ اب یہ دکھاتا ہے کہ دوسرے کی شراب پی لینے کے بعد محتسب کو حکم شرعی کے نفاذ کا خیال آتا ہے اور وہ اس حلقۂ احباب کے جذبات کا لحاظ نہیں کرتا جس میں بیٹھ کر ابھی اس نے مے نوشی کی تھی۔ وہ جام شراب کو توڑ بھی دیتا ہے، یعنی محتسب نہ صرف ریاکار، گناہگار اور حریص ہے، وہ کمینہ بھی ہے۔

اسی مضمون کو ایک دوسرے طریقے سے اسی شگفتہ انداز میں یوں ادا کیا ہے:

با محتسبم عیب مگوئید که او نیز
پیوسته چو ما در طلب عیش مدام است

(محتسب کی برائی مجھ سے مت بیان کرو، اس لئے کہ وہ بھی تو ہمیشہ ہماری ہی طرح

عیشِ مدام کی تلاش میں رہتا ہے)

ایہام قدما کی شاعری کی ایک عام کمزوری ہے۔ تاہم یہاں پر جب ایک ایسے شخص کی شراب نوشی کا ذکر مقصود ہے جس کا کام لوگوں کو اس کام سے روکنا ہے لیکن جو در پردہ تمام غیر شرعی حرکتیں کرتا ہے۔ تو غالباً ایسے شخص کے 'عیش مدام' پر ایہام کا پردہ ڈال دینا ہی تہذیب کا تقاضا تھا!

محتسب کی شریعت شکنی کو ایک جگہ اور بڑے پر لطف طریقے سے یوں بیان کیا ہے:

اے دل طریق رندی از محتسب بیاموز

هست است و در حق او کس ایں گماں ندارد

(اے دل رندی کا طریقہ محتسب سے سیکھ کہ وہ (شراب پی کر) مست بھی رہتا ہے اور (چونکہ وہ محتسب ہے) کسی کو اس کے بارے میں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا) لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ جس کا کام لوگوں کو شراب پینے سے روکنا ہے بھلا وہ بھی کیسے شراب پی سکتا ہے!)

حافظ کے طنز و استہزا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کا لہجہ عموماً نرم اور شریفانہ ہوتا ہے۔ وہ جن لوگوں پر طنز کرتا ہے، ان کے سچائی اور بھلائی کے دعوؤں اور ان کے عمل میں بہت دلچسپ طریقے سے فرق دکھاتا ہے اور یہ ہمیشہ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ اکثر جن پر طعنہ زنی مقصود ہوتی ہے ان پر وہ راست حملہ نہیں کرتا۔ بادی النظر میں معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسری بات کا ذکر کر رہا ہے۔ اس شخص کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ تو ایک ضمنی بات ہے جسے وہ مسکرا کر کہتا ہے اور پھر دوسری بات کی جانب مڑ جاتا ہے۔ حافظ نہ تو بے تحاشا ٹھٹھا مار کر ہنستا ہے اور نہ عام طور سے غصے میں آکر بات کرتا ہے۔ اس کی نرمی اور خندہ زیر لب سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ جیسے اس کے فراخ دل میں ان لوگوں کے لئے بھی جگہ ہے جنہیں وہ غلط کار سمجھتا ہے۔ وہ جب کسی کا مذاق اڑاتا ہے تو انسانیت کی تحقیر نہیں کرتا۔ اس کی اس سنجیدگی اور ملائمت کی وجہ سے اس کے طنز میں بھی غیر معمولی حسن پیدا ہو جاتا ہے اور اس کا تاثر بڑھ جاتا ہے۔

مثلاً جب حافظ کو یہ دکھانا مقصود ہے کہ شہر کا کوتوال لوگوں کی حفاظت نہیں کرتا بلکہ چوروں اور امن شکن عناصر کے ساتھ مل کر خود چوریاں کرواتا ہے۔ تو اسے اس طریقے سے کہا ہے:

عشرت شبگیر کن، مے نوش، کاندر راہ عشق

شبروان را آشنائیہا ست با میر عسس

(رات کے وقت عشرت کرو اور شراب پیو، اس لئے کہ عشق کی راہ میں رات کے وقت راستہ چلنے

والوں (یا چوروں) کی کوتوال کے ساتھ دوستیاں ہیں (اس لئے اس وقت باز پرس کا خطرہ نہیں ہے)

شاہ شجاع کے عہد حکومت کے آغاز میں حافظ نے جو غزل کہی ہے وہ کافی مشہور ہے اس کا مطلع ہے:

سحر ز ہاتفِ غیبم رسید مژدہ بگوش

کہ دورِ شاہ شجاع است ، مے دلیر نبوش

اس غزل کے دو اشعار میں حافظ نے اس جور و جبر کی شکایت کی ہے جو اس کے پہلے کے دور میں تھا اور جس میں لوگوں کی آزادیٔ رائے و گفتار بھی چھین لی گئی تھی اور لوگ علانیہ خوشی مناتے ہوئے بھی ڈرتے تھے:

شد آنکہ اہل نظر بر کنارہ می افتند

ہزار گونہ سخن دردہان و لب خاموش

شراب خانگی از بیم محتسب خوردن

بروئے یار بنوشیم و بانگ نوشا نوش

وہ زمانہ چلا گیا جب اہل نظر ادھر اُدھر چھپتے پھرتے تھے، ان کے منہ میں ہزار طرح کی باتیں ہوتی تھیں، لیکن وہ اپنے لب بند رکھنے پر مجبور تھے۔ محتسب کے خوف سے گھروں کے اندر (چوری چوری) شراب پینا (کتنا برا تھا!) اب ہم یار کے سامنے بیٹھ کر اور نوشا نوش کے نعرے لگا کر پیتے ہیں۔

اہل دَوَل کے کردار میں حافظ کو جو چیز سب سے زیادہ ناپسند تھی وہ ان کی حشمت اور دولت کو جمع کرنے کی خواہش تھی۔ اگر یہ لوگ اپنی دولت کا ایک قلیل حصہ لوگوں کو دیتے بھی تھے تو اس کے سلسلے میں کمینگی کا اظہار ضرور کرتے تھے۔ وہ توقع کرتے تھے کہ شاعر اور اہل علم و فضل ان کی خوشامد کریں اور ان کی تعریف کے پل باندھے جائیں۔ حافظ نے جا بجا ایسے امرا کے سارے گروہ کی مذمت کی ہے اور ان سے دور رہنے کی تلقین کی ہے۔

اپنے وطن شیراز اور وہاں کے لوگوں سے محبت کے علاوہ ایک چیز جو اسے دوسرے ملکوں کے بادشاہوں کے درباروں میں جانے سے روکتی رہتی تھی وہ حافظ کا جذبۂ خودداری تھا۔ شاہ دکن کے دربار میں جانے کے لئے حافظ جہاز میں سوار بھی ہو گئے تھے لیکن جب سمندر میں طوفان آ گیا تو وہ کنارے پر اتر پڑے اور سفر ملتوی کر دیا۔ بعض لوگوں نے اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا کہ

حافظ نے سمندری سفر کی صعوبت سے ڈر کر ایسا کیا۔ ظ۔ انصاری بھی اسی رائے کے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن حافظ کی جس غزل سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے اس کے مقطع پر لوگوں کی نظر شاید نہیں پڑی:

چو حافظ در قناعت کوش و از دنیائے دوں بگذر

کہ یک جو منتِ دُونان بصد من زر نمی ارزد

(حافظ کی طرح قناعت اختیار کرو اور اس کمینی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرو۔ اس لئے کہ کمینوں کی ایک جو کے برابر بھی خوشامد سَو من سونے کی بھی قیمت نہیں رکھتی)

اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ حافظ گو وزیر دکن کے بلانے پر دکن جانے کے لئے تیار ہو گئے تھے لیکن ان کا دل اس سے خوش نہ تھا جب سمندری سفر کی زحمت کا بھی ان کو تجربہ ہوا تو انہوں نے فوراً اپنا ارادہ ملتوی کر دیا ایک شعر میں حافظ کہتے ہیں کہ دولت، دنیا میں سامان عیش حاصل کرنے کے لئے ہوتی ہے جمع کرنے کے لئے نہیں۔ وہ گلاب کے پھول کی مثال دیتے ہیں کہ وہ کس طرح اپنے زر کو لٹا دیتا ہے:

چو گل گر خورده داری خدا را صرف عشرت کن   کہ قارون را غلط ہا داد سودائے زراندوزی

(اگر تیرے پاس کچھ جمع ہے تو خدا کے لئے اسے عشرت حاصل کرنے کے لئے گلاب کے پھول کی طرح صرف کر دے، دیکھ زراندوزی کے جنون کے سبب قارون کا کتنا غلط انجام ہوا)

حافظ ان نو دولت امیروں کا مذاق اڑاتا ہے جو اپنی امارت کا بڑے بھونڈے طریقے سے اشتہار دیتے پھرتے ہیں:

یارب ایں نو دولتاں را بر خر خود شان نشان

کاین ہمہ ناز از غلام ترک و استر می کنند

(خدا کرے ان نو دولتیوں کو ان کے گدھے پر (جس پر سوار ہو کر وہ نکلتے ہیں) شان وشوکت نصیب ہو، یہ لوگ محض اس پر اکڑ رہے ہیں کہ ان کے پاس ترک غلام اور خچر ہیں)

حکام کے اخلاق کو وہ اتنا گرا ہوا سمجھتا ہے کہ ان کی صحبت کو 'ظلمتِ شب یلدا' کہا ہے:

صحبت حکام ظلمت شب یلدا است

(حکام کی صحبت کالی رات کی سیاہی ہے)

وہ 'بھاری بھرکم' لوگوں کو اتنا نالائق اور ریاکار سمجھتا ہے کہ ان سے دور رہنے کی خواہش کرتا ہے:

من وہم صحبتیِ اہلِ ریا دورم باد
از گرانانِ جہاں رطل گراں مارا بس

(اہل ریا کی صحبت سے میں دور ہی رہوں تو اچھا ہے۔ دنیا کے بڑوں (گرانانِ جہان) میں سے میرے لئے شراب کا بڑا پیالہ کافی ہے)

صوفیا اور علمائے ظاہر اور ان کے مبینہ زہد و تقویٰ اور علم و فضل کی جانب حافظ کا جو رویہ تھا اس کے متعلق ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں۔ حافظ بنیادی طور پر دنیوی فلاح اور اخروی نجات حاصل کرنے اور دریافتِ حقیقت کے ان طریقوں کے خلاف ہے جو یہ حضرات اختیار کرتے ہیں۔ بہر حال حافظ کا عملی تجربہ اور مشاہدہ یہی تھا کہ ان حضرات کے دعوے سچے نہیں ہیں:

مارا بمستی افسانہ کردند پیرانِ جاہل شیخانِ گمراہ
از قول زاہد کردیم توبہ وز فعلِ عابد استغفراللہ

(جاہل پیروں اور گمراہ شیخوں نے میرے متعلق مست ہونے کی کہانیاں گڑھی ہیں؛ میں نے تو زاہد کے قول سے توبہ کر لی اور عابد کے فعل سے اللہ کی پناہ مانگ لی ہے)

حافظ کے نزدیک زہد بھی ایک طرح کی مستی ہے، غرور اور خود پرستی کی۔ انسان اس طرح اپنے کو اور دنیا کو دھوکا دیتا ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کر رہا ہے۔ لیکن عام طور سے وہ ایسا کر کے دو باتوں کا خواہشمند ہوتا ہے۔ اول تو یہ کہ لوگ اس کی عبادت گزاری اور تقدس سے مرعوب ہو کر اس کی برتری تسلیم کریں اور اس کی خواہشات تسلیم کریں۔ اس طرح زاہد جو مرتبہ اپنے نیک اعمال اور دوسروں کی بھلائی کر کے حاصل نہیں کر سکتا وہ اپنے زہد و تقویٰ کا رعب ڈال کر حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ زاہد سمجھنے لگتا ہے کہ محض عبادت کر کے اسے خدا کا قرب نصیب ہو جائے گا اور وہ دوسرے معمولی انسانوں سے افضل و برتر ہو جائے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک درباری یا کوئی ماتحت ملازم یہ سمجھتا ہے کہ اگر وہ اپنے حاکم یا مالک کی زیادہ خوشامد اور تعریف کرے تو وہ اس کا مقرب خاص ہو گا اور اسے زیادہ فائدہ پہنچے گا۔ اس طرح ایسے شخص کی نظر انسانوں میں (اور غالباً آخرت میں بھی) افضلیت اور برتری حاصل کرنے کا جو صحیح اور عملی طریقہ ہے اس کی طرف سے ہٹ جاتی ہے۔ وہ خلقِ خدا کی خدمت عام بھلائی کے کاموں کو دوسروں کے ساتھ مل جل کر انجام دینے، اور اپنے دل میں دوسروں کی جانب مودت و انکسار کا جذبہ پیدا کرنے کو اپنی عبادت کے مقابلے میں کم اہمیت دیتا ہے وہ انسانوں سے قریب آنے کے بجائے ان سے

دور ہو جاتا ہے۔

حافظ سمجھتا ہے کہ یہ راہ جو شب زندہ دار زُہاد کو انسانوں اور ہنگامۂ حیات سے دور کرتی ہے، دراصل انہیں اللہ سے بھی دور کرتی ہے۔ جب وہ ان سے کہتا ہے کہ نجات کی راہ مے خانے سے ہو کر گزرتی ہے تو اس کی مراد یہ ہے کہ جب تک انسانوں میں خود پرستی اور خود غرضی کے نشے کی جگہ، محبت اور نیکی کا جوش، یعنی زندگی کی شراب کی سرمستی نہ ہوگی اُن کو نہ تو یہاں مسرّت نصیب ہو سکتی ہے اور نہ کسی دوسری دنیا میں۔ اس دوسری سرمستی کو حافظ 'ہوش میں آنا' کہتا ہے:

ز خانقاہ بہ میخانہ می رود حافظ
مگر ز مستیِ زہد و ریا بہوش آمد

(حافظ خانقاہ سے میخانہ کو جا رہا ہے۔ ضرور اب اس کا زہد و ریا کا نشہ اُتر گیا ہے اور اسے ہوش آ گیا ہے[۳])

حواشی:

۱۔ دیوان حافظ کے سب سے مستند متن میں ۶۹۳ نظمیں ہیں۔ ان میں ۵۷۳ غزلیں، ۴۲ قطعے، ۶۹ رباعیاں، ۶ مثنویاں، ۳ قصیدے اور ایک مخمس شامل ہیں (تاریخ ادبیات ایران از براؤن جلد دوم) براؤن کے مطابق حافظ کا یہ وہ دیوان ہے جو ان کے ترکی شرح نویس سودی نے شائع کیا ہے۔ اسی کے متن کو بروک ہاؤس اور روزنِ زوانگ شوانا ؤ نے جرمنی میں شائع کیا۔

۲۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ وہ لوگ جو سونے اور چاندی کا ذخیرہ کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، ان کے لئے آخرت میں عذاب الیم ہے۔ ہمارے تمام بڑے شعرا نے اس پر لکھا ہے۔ شیخ سعدی نے کہا ہے:

بخیلی توانگر بدینار و سیم — طلسمت بالائے گنج مقیم
پس از مردن و گرد کردن چو مور — بخور پیش ازاں کت خورد کرمِ گور

۳۔ امام غزالی نے بھی ایک رباعی میں کہا ہے کہ صومعہ اور خانقاہ کی عبادتوں میں یار (اللہ) گم ہو گیا ہے، اب اسے خرابات میں تلاش کر رہا ہوں:

با جامہ نمازی بسرِ خُم کردیم — وز آبِ خرابات تیمم کردیم
شاید کہ در این میکدہ ہا دریابیم — آن یار کہ در صومعہ ہا گم کردیم

(۱۰)

حافظ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے کو ہنر مند طبقے کا ایک فرد سمجھتا تھا۔ قدیم فارسی اور اردو کے کئی شاعروں نے اس کا اعادہ کیا ہے[1] جس کی وجہ سے ہمیں ان کا طبقاتی نظام معین کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ غالباً اہل ہنر سے مراد تمام وہ جسمانی یا ذہنی محنت کرنے والے لوگ یا افراد ہیں جن کا پیشہ ان کے کام میں خاص مہارت وزیرکی کا مطالبہ کرتا ہے۔ جس طریقے سے فارسی اور اردو ادب میں 'اہل ہنر' یا 'ہنر مند' کی اصطلاح کا استعمال ہوا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس طبقے میں دست کار اور وہ دانشور، جو شعر و ادب کو اپنا پیشہ بناتے ہیں اور ان کے علاوہ تمام دوسرے وہ لوگ جن کو ہم جدید اصطلاح میں[1] فن کار یا آرٹسٹ کہتے ہیں، شامل ہیں۔ ازمنۂ وسطیٰ کی سماجی تشکیل اور اس میں ادیبوں اور فنکاروں کے مقام پر اس اصطلاح سے جو روشنی پڑتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سماج میں ادیب شاعر اور فن کار، دستکاروں کا ہی ایک حصہ سمجھے جاتے تھے اور اہل ہنر میں شامل تھے آرٹسٹ یا فن کاروں کے گروہ کے لئے کوئی علاحدہ اصطلاح استعمال نہیں کی گئی ہے۔

جاگیری سماج کی تمام صنعتوں، نیز فن عمارت اور فنون لطیفہ اور ادب وانشا کی تخلیق و ترقی کے لئے ہم اسی ہنر مند طبقے کے محتاج ہیں۔ ان کے اوپر امرا اور جاگیر دار تھے اور ان کے نیچے محنت کشوں کی عظیم اکثریت، کسان اور مزدور۔ سماج کی عام خوشحالی یا بدحالی کے ساتھ اس طبقے کی حالت بھی بنتی اور بگڑتی رہتی تھی۔ سیاسی خوش انتظامی اور امن کے دنوں میں جب تجارت ترقی کرتی تھی تو تاجروں کے طبقے کے ساتھ مل کر اس طبقے میں بھی توانائی کے آثار نمودار ہوتے تھے۔ محنت کش عوام کی خوشحالی کا بھی اس طبقے پر مجموعی حیثیت سے اچھا اثر پڑتا ہوگا، اس لئے کہ دیہات میں اہل ہنر گاؤں کے لوگوں کی مجموعی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے دوسری طرف اس طبقے کا تعلق امرا سے بھی ہوتا تھا جن کے لئے وہ طرح طرح کی چیزیں بناتے تھے اور جن کی تفریح کے لئے وہ

فنون لطیفہ کو استعمال کرتے تھے۔ لیکن اگر ایک طرف اس گروہ کی امرا کے ساتھ وابستگی تھی، تو دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہے کہ ان کی ہنر مندی، یعنی ان کی دماغی اور جسمانی لیاقت و مہارت ان میں خود اعتمادی اور شخصی آزادی کا بھی جذبہ پیدا کرتی تھی۔ اور محنت انہیں دوسرے عام محنت کشوں کے ساتھ وابستہ کرتی تھی۔ ان کی حساس طبیعت ہمیشہ امرا کی سختیوں اور مظالم اور ان کی جہالت اور بے راہ روی کے خلاف احتجاج بلند کرتی تھی اور وہ سماج میں اعتدال، انصاف، شخصی آزادی، امن اور خوشحالی کا مطالبہ کرتے رہتے تھے۔ ان جذبات کا بہترین اظہار شیخ سعدی کی گلستاں اور بوستاں میں کیا گیا ہے۔ حافظ کے کلام میں بھی جا بجا اس قسم کے تاثرات پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک غزل میں کہا ہے:

پدید آمد رسومِ بیوفائی — نماند از کس نشانِ آشنائی
برند از فاقہ پیشِ ہر خسیسی — کنوں اہل ہنر دست گدائی
کسی کو، فاضل است امروز در دہر — نمی بیند زغم یک دم رسائی
می کسی کو جاہل است اندر تنعم — متاعِ او بود ہردم بہائی
اگر شاعر بخواند شعر چون آب — کہ دل را زد فزاید روشنائی
نہ بخشندش جوی از بخل و امساک — اگر خود فی المثل باشد سنائی
خرد در گوشِ ہوشم دوش می گفت — برو صبری مکن در بی نوائی

بیا حافظ بجاں ایں پند بنیوش
کہ گہ از پا بیفتی بر سر آئی

بے وفائی کی رسمیں ظاہر ہوگئی ہیں اور کسی میں دوستی کا نشان باقی نہیں رہا ہے۔ فاقہ کشی سے مجبور ہو کر اہل ہنر ہر ایک کنجوس کے آگے دست گدائی پھیلاتے ہیں۔ آج وہ لوگ جو زمانے میں فاضل مانے جاتے ہیں ایک لمحے کے لئے بھی غم سے رہا نہیں ہیں۔ اور وہ لوگ جو جاہل ہیں عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کی متاع (یعنی جہالت) کی ہردم قیمت دی جاتی ہے۔ اگر شاعر ایسا شعر پڑھے جو پانی کی طرح (صاف اور روشن) ہے اور جس سے دل کی روشنی بڑھتی ہے تو، چاہے وہ سنائی کی طرح کا ہی (بڑا شاعر) کیوں نہ ہو بخل اور کنجوسی کی وجہ سے اسے ایک جو بھی نہیں ملے

گا۔ عقل نے کل میرے ہوش کے کان میں کہا کہ جاؤ اور اپنی اس بدحالی
کو صبر کے ساتھ برداشت کر۔ حافظ میری جان کی قسم! میری یہ نصیحت سن
کہ اگر آج تو گر پڑا ہے۔ تو کل تیرا سر اونچا ہوگا۔

اہل ہنر کی سب سے قیمتی متاع ان کا ہنر ہے۔ حافظ شکایت کرتا ہے کہ آج کل ہنر کی ہی کساد بازاری ہے:

ہنر نمی خرد ایام و غیر از ہم نیست
کجا روم بہ تجارت بایں کساد متاع

(زمانہ ہنر کو ہی نہیں خریدتا، اور میرے پاس اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ ایسے مال کو لے کر تجارت کے لئے کہاں جاؤں جس کی مانگ نہیں ہے؟)

حافظ کے کلام میں عام طور سے تلخی اور غصہ نہیں پایا جاتا۔ لیکن اپنے طبقے کی تباہ حالی اور امیروں اور اہل اختیار کے ہاتھوں ان کی مذلت اور ناقدری سے جیسے وہ تلملا جاتا ہے اور بے انتہا طنزیہ لہجے میں کہتا ہے:

فلک بمردم نادان دہد زمام مراد
تو اہل دانش و فضلی ہمیں گناہت بس!

(آسمان نادانوں (جاہلوں) کی مراد پوری کرتا ہے۔ تو اہل دانش و فضل میں سے ہے؛ تیرا یہی گناہ کافی ہے!)

ایک دوسرے شعر میں نہایت غم و غصے کے ساتھ احتجاج کیا ہے کہ آسمان اہل ہنر پر ہی ڈاکے مارتا ہے:

ارغواں سازِ فلک رہزن اہل ہنر است
چوں ازیں غصہ نالیم و چرا نخروشیم

اہل ہنر کی امرا کے ہاتھوں ناقدری اور اہل حکم کے جابرانہ اعمال کے خلاف کبھی کبھی حافظ کا ردِ عمل بہت سخت ہوتا تھا اور وہ جارحانہ انداز میں کہتا تھا:

گر محتسبت بر کدو بادہ زند سنگ
بشکن تو کدوئی سرِ او نیز بخشتے

(اگر محتسب تیرے شراب کے کدو (صراحی) پر پتھر مارے تو تو بھی ایک اینٹ سے اس کے سر کے

کدو کو توڑ دے!)

اور اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر کسی حاکم کو مخاطب کر کے اس نے یہ رباعی لکھی:

تا کی بود این جور و جفا کردن تو　　بیہودہ ہمہ خلائق آزردن تو
تیغ است بدست اہل دل خون آلود　　گر یر تو رسد، خون تو برگردن تو

اور کبھی کبھی حافظ کو یہ محسوس کر کے بڑا دکھ ہوتا تھا کہ 'ظلم کے عقاب' نے ہر چہار طرف اپنے پر پھیلا دیئے ہیں، لیکن اسے ختم کرنے کے لئے کسی گوشہ نشین کا تیر و کمان نہیں ہے:

عقابِ جور کشادہ ست بال در ہمہ شہر
کمانِ گوشہ نشینی و تیر آھی نیست

حواشی:

ا۔ چنانچہ سودا کا شعر ہے:

ہوں تو چراغِ راہ ہنر زیر آسماں　لیکن خموش ہو کے سر شام رہ گیا

(۱۱)

بلاشبہ فکرِ حافظ کے کئی رجحانات ایسے بھی ہیں جو جدید، فعال، روشن خیال ذہنیت کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتے اور جو خود حافظ کے ان توانا پہلوؤں کے متضاد ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

مثلاً کہیں کہیں حافظ کے کلام میں شدید قسم کی تقدیر پرستی پائی جاتی ہے، اور انسان کو قطعی مجبور و بے بس بتایا گیا ہے:

بر عمل تکیہ مکن خواجہ کہ در روزِ ازل
توچہ دانی قلم صنع بنامت چہ نوشت

(اے خواجہ اپنے عمل پر بھروسہ مت کر، اس لئے کہ تجھے معلوم نہیں ہے کہ بنانے والے قلم نے روز ازل تیرے نام پر کیا لکھ دیا ہے)

اور چونکہ انسان اس دنیا میں بے بس اور مجبور ہے اس کی امیدیں اکثر ناکامی اور محرومی میں بدل جاتی ہیں، اور ہونا وہی ہے جو قسمت میں لکھا ہے، اس لئے اسے یہ صلاح دی گئی ہے کہ وہ ان عظیم مخالفتوں کے سامنے ہتھیار ڈال دے اور ان کا مقابلہ کرنے کی نہیں بلکہ ان کو بھلانے کی کوشش کرے:

بیا کہ قصرِ اَمل سخت ست بنیاد است
بیار بادہ کہ بنیاد عمر برباد است

(امید کے قصر کی بنیاد بہت کمزور ہے۔ اور عمر کی نیو کچی (یا برباد) ہے، اس لئے شراب لاؤ (تاکہ اس غم کو بھلا دیں)

یا پھر اندوہ والم کے اس 'محنت آباد' سے نجات کا طریقہ یہ ہے کہ انسان تمام ان رشتوں اور تعلقات کو توڑ دے جو اسے دنیا اور دنیا والوں سے باندھتے ہیں، درویشی کی راہ اختیار کر لی جائے اور دوسری دنیا سے لو لگا کر 'کنگرۂ عرش' کی طرف پرواز کی کوشش کی جائے:

غلام ہمت آنم کہ زیر چرخ کبود | زہر چہ رنگ تعلق پذیرد آزاد است
تراز کنگرۂ عرش می زنند صفیر | ندامت کہ دریں دامگہ چہ افتاد است
رضا بدادہ بدہ وز جبیں گرہ بکشای | کہ بر من وتو در اختیار نکشاد است

میں اس شخص کو بڑا ہمت والا تسلیم کرتا ہوں، جو اس نیلے آسمان کے نیچے ہر ایک ایسی چیز سے قطع تعلق کرے جس سے کہ اس کا رشتہ ہو۔ تو اس دنیا کے جال میں کیوں پھنسا پڑا ہے۔ تجھے آسمان کے کنگرے سے آنے والے نغمے بلا رہے ہیں جو کچھ تجھے دیا گیا ہے اس پر اپنی رضا کا اظہار کر اور اپنی پیشانی کی گرہ کھول دے، اس لئے کہ میرے اور تیرے لئے اختیار کا دروازہ نہیں کھلا ہے۔

جن خیالات کا اظہار ان اشعار میں کیا گیا ہے۔ ان میں یقیناً وہ تمام رجحانات پائے جاتے ہیں جن کا ظ۔ انصاری نے ذکر کیا ہے؛ یعنی تقدیر پرستی، انسان کی مجبوری اور اس کی انفعالی کیفیت اور زندگی سے بھاگ کر میخانے، کنج عزلت یا کنگرۂ عرش میں پناہ لینے کا جذبہ۔ ان نظریوں میں کسی قسم کی جدت بھی نہیں ہے، جس مدرسۂ فکر اور ذہنیت کا ان میں اظہار کیا گیا ہے وہ صدیوں سے لوگوں میں پھیلے ہوئے تھے اور ہمارے ملک میں تو ابھی تک کافی شدید اور سنگین طریقے سے پائے جاتے ہیں۔

ان کا ماخذ انسان کی وہ حقیقی بے بسی اور مجبوری ہے جو فطرت یا معاشرت کی ان قوتوں اور حادثات کے سامنے محسوس کرتا ہے، جو اس کی زندگی کو محبوس یا مجبور کرتے ہیں جن کی مطلق العنانی وقتاً فوقتاً بڑی بے رحمی سے اسے مجروح اور تباہ کر دیتی ہے اور اس کے قصر امید کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ لیکن جس حد تک انسان کے دست و بازو کی محنت اور اس کے ذہن کی روشنی ایک دوسرے کے ارتقا کا سبب بنتے ہوئے تخلیق اور علم کے کارواں کو آگے بڑھاتے ہیں وہ فطرت اور معاشرت دونوں کے سامنے، اس حد تک اپنے کو کم مجبور اور زیادہ آزاد محسوس کرتا ہے۔ انسان کی ذہنی اور معاشرتی آزادی کی راہ دراصل جہل اور لاشعوریت کی تاریکی اور لاچاری کے خلاف مستقل اور مسلسل مجاہدے کی راہ ہے۔ فطرت اور سماج کی حقیقت کا مشاہدہ اور ان کی معرفت اسی مجاہدے کے ساتھ وابستہ ہے۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ان کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ انسانی آزادی کی حد علم اور حقیقت کی معرفت کی حد ہے۔ جب انسان کے علم و شعور کی حدیں بڑھتی ہیں تو

اس کی آزادی بھی بڑھ جاتی ہے۔ وہ اس حد تک فطرت کا محکوم ہونے کے بجائے اس کا حاکم بن جاتا ہے، اور معاشرتی تصادم اور تشنج کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بجائے اس کی ایسی نئی اور بہتر تشکیل کرتا ہے۔ جس میں خیر و فلاح، اور اس لئے مسرت کے تمام ممکنہ مادّی اور روحانی وسائل زیادہ سے زیادہ انسانوں کے لئے احاطہ کر لئے جاتے ہیں۔

جب ہم قدیم زمانے کے کسی بڑے ادیب یا شاعر کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ اس کی تخلیقات میں فی الجملہ روحِ عصر کی جھلک ہے تو اس سے ہماری مراد یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے عہد کے انسانی رشتوں اور باہمی تعلقات اور ان سے پیدا ہونے والے واقعات، جذبات، احساسات اور ان کے الجھاؤ اور تناؤ کی اس طرح سے عکاسی اور مصوری کرتا ہے جس کے نتیجے کے طور پر انسانوں میں ایسی جذباتی کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں اور ان کے شعور میں ایسی تبدیلی اور حرکت نمودار ہوتی ہے جو زندگی سے ان کی وابستگی کو بڑھا دیتی ہے۔ ایسے شاعر کی فکر میں اپنے عہد کے بہت سے ایسے روایتی اور رسمی تصورات و عقائد بھی موجود ہوتے ہیں جنہیں ہم جدید علوم کی روشنی میں مسترد کرتے ہیں۔ معاشرت کے تعلقات اور اس کے ارتقا کے اصول کا علم، آج ہمیں ادھورا اور نامکمل معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ اس فکر کے وہ عناصر ہیں جو ہمارے لئے خس و خاشاک کی طرح ہیں۔ لیکن اس کی نظم کے باغ کے مہکتے ہوئے پھول وہاں کھلتے ہیں جہاں وہ ان روایتی اور رسمی تصورات اور عقائد کی حدوں کے باوجود، اور ان سے اونچا اٹھ کر انسانی زندگی اور اسکے پیچ و خم پر اپنی نظر ڈالتا ہے۔ رنج و محن میں گرفتار انسانوں کے لئے اس کے نغمے جانفزا ہوتے ہیں۔ جو تعلقات الجھ گئے ہیں، انہیں وہ سلجھانے کی کوشش کرتا ہے، اس لئے کہ اس کی نظر انسانی دل کی ان پوشیدہ گہرائیوں تک پہنچتی ہے۔ جہاں سے محبت اور نفرت، خوشی اور رنج کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ وہ انسانوں میں انفرادی اور اجتماعی آزادی کی روح پھونکتا ہے، اس لئے کہ وہ عام مسرت اور خوش دلی کا متلاشی ہوتا ہے۔ اور بغیر آزادی کے یہ دولت نصیب نہیں ہوتی۔ وہ تمام ان طاقتوں کی مخالفت کرتا ہے اور ان کے انہدام کا متمنی ہوتا ہے جو انسانی اجتماعیت کی خوشی اور اس کے خوش اور آزاد رہنے کے حق کو سلب کرتی ہیں۔ زندگی کو مجموعی حیثیت سے حسین اور پر لطف دیکھنے اور بنانے کی شدید خواہش اسے حسن اور محبت، خیر اور برکت، امن اور حریّت کا روح پرور مغنّی بناتی ہے۔ اور یہی تمنا اسے زندگی کے ہر شعبے میں قبح و کثافت، فساد و انتشار، استبداد و تعدّی کے استیصال کا آتشیں پیامبر بننے پر آمادہ کرتی ہے۔

(۱۲)

حافظ کے کلام میں عشق ومحبت کے ہمہ گیر جذبے کی سرخوشی اور معاشرت اور فطرت میں حسن ولطافت سے پیدا ہونے والے احساسات کے کیف وسرور کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

اسی تصویر کا دوسرا رخ وہ المنا کی اور دل کو پگھلا دینے والی بے چینی ہے جو شعر حافظ میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب مختلف اسباب کی بنا پر محبت اور دوستی، یعنی نشاط حیات کے بنیادی محرکات کی راہیں اسے مسدود نظر آتی ہیں۔ اس کے فراق ومحرومی کے نغمے بعض مرتبہ محض اس کی ذاتی کلفت وکوفت کا اظہار نہیں کرتے بلکہ تمام مجبور اور محروم انسانوں کی غمزدہ روح کی پکار معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن حافظ کی ان غم ناک نداؤں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مایوسی کی فضا نہیں پیدا کر دیتی۔ مثلاً اگر حافظ دوستوں کے بچھڑ جانے پر خون کے آنسو روتا ہے (اور اس موضوع پر اس نے بار بار لکھا ہے) تو اس کی یہ خوں فشانی جذبۂ دوستی کی گراں مائگی کو بڑھاتی ہے اور ہمارے دلوں میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ ہم جنس رفیقوں کا ساتھ اور دوست داری زندگی کی عظیم ترین نعمتوں میں سے ہے۔

حافظ زندگی میں غم کے پہلو کو دلوں کو پژمردہ یا آزردہ کرنے کے مقصد سے نہیں نمایاں کرتا۔ اس کا غم محبت کے سوز وساز میں اضافہ کرتا ہے اور اس کے ذریعے سے زندگی کی خوبصورتی اور تابانی جیسے بڑھ جاتی ہے۔

مثلاً اس غزل میں بچھڑے ہوئے دوستوں کی یاد کی غم گینی کے ساتھ، رفاقت کی خوشگواریوں اور مسرتوں کا اتنے لطیف پیرایہ سے ذکر کیا گیا ہے کہ اس سے پڑھنے والے کے دل پر دوستی کے حسن اور اس کی خوبیوں کا نقشہ ثبت ہو جاتا ہے:

روزِ وصل دوست داران یاد باد — یاد باد آن روزگاران یاد باد
این زمان در کس وفاداری نماند — زان وفاداران و یاران یاد باد

کامم از تلخی غم چون زہر گشت — بانگِ نوشِ بادہ خواران یاد باد
من کہ در تدبیر غم بیچارہ ام — چارۂ آن غم گساران یاد باد
گرچہ یاران فارغ انداز یاد من — از من ایشان را ہزاران یاد باد

اور نیچے لکھے ہوئے شعر میں جملوں کی تکرا، اگرایک طرف دوست کے بغیر زندگی کی المناک بے کیفی کا اظہار کرتی ہے تو دوسری طرف یہی تکرار ایک مضطرب دل کا پیہم مطالبہ بھی ہے جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ وہ پورا نہ ہو جائے:

ذوقِ چنان ندارد و بے دوست زندگانی
بے دوست زندگانی ذوقِ چناں ندارد

اسی طرح ان سادہ لفظوں میں کتنا اشتیاق اور خلوص ہے:

یا رب امان دہ تا باز بیند
چشم محبانِ ، روئے حبیباں

ایک مسلسل غزل میں حافظؒ نے اپنے کسی بہت ہی عزیز دوست کی جلاوطنی کا ذکر کیا ہے۔ غزل کے ایک شعر میں یہ اشارہ بھی ہے کہ بادشاہ وقت کا عتاب اسے شیراز کو چھوڑ دینے پر مجبور کر رہا ہے:

دیدمش دوش کہ سرمست وخراماں می رفت — جام می در کف و در مجلس رنداں می رفت
چوں ہمی گفتمش اے مونس دیرینہ من — سخت می گفت دل آزردہ پریشاں می رفت
نقش خوارزم وخیال لب جیحون می بست — با ہزاران گلہ از ملک سلیماں می رفت
می شد آنکس کہ چو او جان سخن کس نشاخت — من ہمی دیدم و از کالبدم جان می رفت
گفتم اکنوں سخن خوش کہ بگوید با ما — کان شکر لہجۂ خوشگوئی ، سخنداں می رفت
لابہ بسیار نمودم کہ مرو، سود نداشت — زانکہ کار از نظر زحمت سلطاں می رفت
بادشاہا زکرم از سر جرمش بگذر — چہ کند سوختہ ازغایت حرماں می رفت

چون بشد آں صنم از دیدۂ حافظ غائب
اشک ہموارۂ ز رخسار بداماں می رفت

(کل میں نے اسے دیکھا کہ سرمست وخراماں وہ رندوں کی مجلس میں آیا جب میں نے اپنا مونس دیرینہ کہہ کر اس سے باتیں شروع کیں تو

معلوم ہوا کہ وہ سخت آزردہ دل اور پریشان ہے، وہ خوارزم اور لب جیحون (جیسے دوردراز مقام) جانے کے منصوبے بنا رہا تھا اور اپنے وطن سے ہزاروں گِلے کر کے چلے جانے کی بات سوچ رہا تھا۔ وہ جس کی طرح روح سخن کو پہچاننے والا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ اب نہیں رہا، میں دیکھتا رہ گیا اور جیسے میرے جسم سے جان نکل گئی۔ میں کہتا ہوں کہ اب اتنی اچھی باتیں مجھ سے کون کرے گا جبکہ وہ شکر لہجہ، خوش گو اور سخندان چلا گیا ہے۔ میں نے اس کی بہت منت بھی کی اور کہا کہ مت جاؤ لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا اس لئے کہ سلطان کی مرحمت کی نظر اس سے پھر گئی تھی..... اے بادشاہ از روئے کرم اس کے جرم کو درگذر کر، وہ غائت حرماں کی وجہ سے سوختہ دل تھا.... جب سے وہ محبوب دوست حافظ کی نظروں سے غائب ہوگیا ہے۔ اس کی آنکھوں سے پیہم آنسو بہہ بہہ کر رخسار سے دامن تک پہنچ رہے ہیں۔)

دوستوں کی جدائی کا صدمہ تقریباً سب کو ہی برداشت کرنا ہوتا ہے۔ حافظ نے فراق کی اس واردات کو بڑی حسین سادگی اور واقعیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس نے اپنے دوست کی خوبیوں، اس کی سخن دانی اور شکر لہجگی کا دلکش نقشہ کھینچا ہے اور بے تکلف دوستوں کی مجلس انس میں اس کی شگفتگی اور دلپذیری کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر ایسے رفیق کی آزردہ دلی اور پریشانی اور بادشاہ کی زیادتی سے مجبور ہو کر اس کی جلاوطنی پر اپنے دلی صدمے کا اظہار کیا ہے اور اپنی ساری اندوہگینی اور اشتیاق کو اس ایک سادہ سے سوال میں مرکوز کر دیا ہے کہ ''اب مجھ سے اچھی اچھی باتیں کون کرے گا؟'' اس طرح حافظ نے زندگی کے بظاہر ایک چھوٹے سے واقعے اور محبت کی ایک عام واردات سے رفاقت کی اصل روح کو اس کی تمام جذباتی حرارت کے ساتھ تسخیر کر لیا ہے جیسے گرمیوں کی دم گھٹنے والی شام میں موتیا کے سفید اور شاداب پھول ساری فضا میں عطر کی ٹھنڈی پھوار برسا دیتے ہیں۔

(۱۳)

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ حافظ عشق و محبت کو انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی حیات بلکہ ساری کائنات کا سب سے گراں بہا اصول سمجھتا ہے اور اس کا یہ عقیدہ تصوف کے فلسفۂ وحدت وجود کے مطابق تھا۔ اس فلسفے کی رو سے چونکہ تمام خلائق ذات الٰہی کی ہی مظہر ہیں۔ اس لئے خلق خدا سے محبت عشق الٰہی کے مترادف ہے۔ یہاں پر تصوف کے رموز و اسرار اور مجاز و حقیقت کی موشگافیوں پر بحث کرنا ہمارا مقصد نہیں ہے۔ البتہ یہ ایک واقعہ ہے کہ اس نظریۂ حیات سے جہاں بہت سے لوگوں کے لئے دنیا اور اس کی زندگی سے فرار کی راہیں کھلیں وہاں بہت سے آزاد مردوں نے اس کی تشریح بالکل دوسرے نہج سے کی موخر الذکر نے اس فلسفے سے انسانوں کی مساوات، اخوت اور آزادی اور رواداری کے اصول اخذ کئے۔ اس کی آڑ لے کر آزاد ذہنوں نے اپنے عہد کے ریاکار اور خود پرست زُہاد و مشائخ اور بے انصافی اور ظلم کرنے والے امرا اور اہل اختیار پر سخت نکتہ چینی کی اور ایک زیادہ منصفانہ، صلح کل اور خوش و خرم سماج کا مطالبہ کیا۔ گو ان موخر الذکر ہستیوں کی فکر میں بھی متضاد باتیں ملتی ہیں لیکن ہمیں دراصل دیکھنا یہ چاہئے کہ انہوں نے کس طرح اور کس حد تک مروجہ مابعد الطبعیاتی عقائد و نظریات کو انسانوں کی حقیقی مادّی اور ذہنی زندگی کو ان عقائد سے علیحدہ کر کے دیکھا اور اس زندگی کو معاشرتی اور انفرادی تجربات اور علم کی روشنی میں پرکھا۔ حافظ کی عظمت یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے مابعد الطبعیاتی تصورات کو اپنی اور اپنی طرح کے دوسرے انسانوں کی انفرادی اور معاشرتی زندگی اور اس کے تجربات کا ماتحت بناتا ہے۔ ہندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ کے تصوف اور بھگتی کے بڑے شاعروں (بابا فرید شکر گنج، خسرو، تلسی، وارث شاہ، شاہ عبداللطیف، وغیرہ) کی بھی یہی خصوصیت ہے۔

حافظ کو اپنے عہد کے معاشرتی تعلقات کی ہر بنیاد میں ''خلل'' نظر آیا اور اس نے محسوس کیا کہ صرف وہ تعلقات مضبوط اور استوار ہو سکتے ہیں جو انسانوں کے باہمی اُنس و تعاون کی

بنا پر قائم کیے گئے ہیں۔ چنانچہ وہ محبت کی جہانگیری کا مطالبہ کرتا ہے:

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

(دنیا میں ہر شے (رشتے، عمل اور ادارے) کی بنیاد میں
کھوٹ اور خرابی ہے، صرف محبت (یعنی باہمی تعاون، صلح اور احترام
آدمیت) کی بنیاد پر قائم کیے ہوئے رشتوں میں کوئی خلل نہیں ہوتا۔)

غرور اور خود غرضی، ہوس اور حرص انسانوں میں دشمنی اور نفاق پیدا کرتے ہیں اور عام بربادی اور رنج و مصائب کا باعث بن جاتے ہیں۔ اسی طرح انسانوں کو خوشی حاصل نہیں ہوتی اور ان کے دل مردہ ہو جاتے ہیں:

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

(ہم نے سکندر اور دارا (جنہوں نے غرور اور نفاق کی
بنا پر ایک دوسرے سے جنگ کی تھی اور قتل و خون کیا تھا) کا قصہ نہیں
پڑھا ہے، ہم سے مہر و وفا کی حکایت کے علاوہ اور کچھ مت پوچھو!)

حافظ انسانوں سے کہتا ہے کہ ایسی تباہ کن دشمنیوں کو اپنے دل سے نکال دیں، اور دوستی اور رفاقت کا بیج اپنے دل میں بوئیں!

درختِ دوستی بنشاں کہ کام دل بہار آرد
نہال دشمنی بر کن کہ رنج بے شمار آرد

(دوستی کا درخت لگاؤ تا کہ تمہارے دل کی مراد پھولے پھلے،
دشمنی کے پودے کو اکھاڑ دو اس لئے کہ وہ بے شمار رنج لاتا ہے۔)

حافظ عشق و محبت اور صدق و صفا کو لازم و ملزوم سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک بغیر سچائی کے زندگی میں خیر و برکت ممکن نہیں ہے۔ ایک بڑے زوردار اور حسین شعر میں کہا ہے:

بصدق کوش کہ خورشید زاید از نفست
کہ از دروغ سیہ روئے گشت صبح نخست

(سچائی پر قائم رہنے کی کوشش کرو تا کہ تمہاری سانس سے

سورج (کی طرح علم کی روشنی اور عمل کی حرارت) پیدا ہو۔ پہلی صبح (صبح کاذب) جھوٹی تھی، اس لئے اس کا چہرہ سیاہ ہوگیا۔)

جارحانہ جنگ بازی اور مردم آزاری میں شیخ سعدی کے لافانی اشعار ہیں:

اگر زیر دستی در آیاد ز پاے　　حذر کن ز نالیدنش بر خدائی
چو شاید گرفتن بہ نرمی دیار　　بہ پیکار خون از مسامے میار
بمردی! کہ مسلکِ سراسر زمین　　میرزد کہ خونے چکد بر زمین

(اگر کوئی کمزور تمہارے پاؤں کے نیچے آجائے تو خدا کے لئے اس کی فریاد سے بچو۔ جب تم ملکوں کو اپنی نرمی سے فتح کر سکتے ہو تو کسی انسان کے جسم کے ایک مسام سے بھی جنگ کر کے خون نہ بہاؤ.....قسم ہے کہ ساری زمین کے ملکوں کی بھی اتنی قیمت نہیں ہے کہ اس کے عوض خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر بہایا جائے!

حافظؔ نے بھی امن و صلح کے اس بلند انسانی نظریہ کو پیش کیا ہے:

آن کس کہ اوفتاد خدایش گرفت دست　　بس بر تو باد تا غم اوفتادگان خوری
یک حرفِ صوفیانہ بگویم، اجازت است　　اے نورِ دیدہ! صلح بہ از جنگ و داوری

(جو شخص گر پڑا ہے، خدا اس کا ہاتھ پکڑتا ہے، بس تم کو بھی چاہئے کہ گرے ہوؤں کے لئے اپنے دل میں درد پیدا کرو.....اجازت ہو تو میں تم سے ایک صوفیانہ بات کہوں، میرے نوردیدہ! امن، جنگ اور داوری سے بہتر ہے۔)

(۱۴)

زندگی کے تجربے اور ماضی کے علم نے حافظ کو یہ بتایا تھا کہ محبت کی ہمہ گیری، اور حسن و صداقت کی ضوفشانی کے لئے اس معاشرت کی فضا سازگار نہیں جس کا وہ فرد تھا۔ وہ خود کو ایسے ماحول میں گھرا ہوا محسوس کرتا تھا جہاں عشق کے معنی ہی غم و اندوہ کے ہو گئے تھے اور بیشتر انسان اگر مسرت و انبساط کی چند گھڑیاں بسر کرنے کی کوشش بھی کرتے تھے تو وہ ''دولت مستعجل'' ہوتی تھی۔ معاشری مناقشات کے سبب سے لوگوں کی اکثریت زبردستی اور تنگ دستی کا شکار تھی، اور یہ حالات اخلاقی زوال اور نفاق وریا پیدا کرتے تھے۔ زندگی ایک خارزار کے مانند تھی اور وہ جو گلوں کی جستجو میں تھے، ان کے پاؤں کانٹوں نے چھلنی کر دئے تھے:

تا صد ہزار خار نمی روید از زمین
از گلبنی، گلی بگلستان نمی رسد

(جب تک زمین سے سو ہزار کانٹے نہیں اُگتے، گلاب کے درخت سے
ایک پھول بھی گلستاں تک نہیں پہنچ پاتا)

لیکن ان نامساعد حالات میں بھی حافظ کا پیغام جہدِ حیات اور امید کا پیغام ہے:

ہر کہ سرگرداں بعالم رفت و غم خواری نیافت — آخرالامر او بغمخواری رسد، ہاں غم مخور
در بیاباں گر بشوقِ کعبہ خواہی زد قدم — سرزنشہا گر کند خار مغیلاں غم مخور
گرچہ منزل بس خطرناک است و مقصد ناپدید — ہیچ راہی نیست کورا نیست پایاں غم مخور

(وہ جو ساری دنیا میں پریشان پھرا اور اس نے غم خواری نہیں پائی، آخرکار اس کی بھی غم خواری ہوگی، تو غم نہ کر۔ اگر کعبہ کے شوق میں تو بیاباں طے کرنے کے لئے قدم اٹھاتا ہے اور سخت کانٹے تجھے چبھتے ہیں تو غم نہ کر.... اگر تیری منزل سخت خطرناک ہے اور اس کا خاتمہ نہیں نظر آتا، پھر

بھی ایسی کوئی راہ نہیں جس کا خاتمہ نہ ہو، تو غم نہ کر)

بلند انسانی مقاصد کو حاصل کرنے میں جن مصائب سے انسان دوچار ہوتے ہیں اور جن ہُموم کا ان پر نزول ہوتا ہے، حافظ ان کا تذکرہ اتنی خوبی سے کرتا ہے کہ تلخیاں اور جگر خراشیاں اپنی نوعیت کو ہی جیسے بدل دیتی ہیں۔ ان صعوبتوں پر بھی عظمت کے آفتاب کی چھوٹیں پڑنے لگتی ہیں۔ اخلاقی اور حیاتی بلندیوں کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے انسانوں کے پسینے کے قطروں کو حافظ ستاروں کی سی درخشانی عطا کرتا ہے۔ وہ تمام ایسی عافیت جوئی اور مصلحت کوشی اور اس قسم کی سمجھداری کو سطحی اور پست سمجھتا ہے جو انسان کو عظیم تر خیر و سعادت کی جانب بے دریغ اور بے محابا بڑھنے سے روکیں۔ ایسی دلی عقل کے مقابلے میں وہ سچائی اور محبت کے جذبے سے لبریز انسانوں کے مجنونانہ جوش کو ترجیح دیتا ہے اور ایسی خود پرست عافیت جوئی کے مقابلے میں وہ لیلیٰ مقصود کے لئے جان کو خطرے میں ڈالنا بہتر سمجھتا ہے:

در رہِ منزلِ لیلی کہ خطرہاست بجاں
شرط اول قدم اینست کہ مجنوں باشی

(منزلِ لیلیٰ کی راہ میں جان کو خطرہ ہے، اس لئے راہ پر چلنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ تم مجنوں بنو)

تاہم یہ سمجھنا صحیح نہیں ہوگا کہ حافظ حیات کو سرخرو اور حسین تر بنانے کی جدوجہد میں عقل کو بالائے طاق رکھ کر مجنونانہ حرکتیں کرنے کی تلقین کرتا ہے وہ یہاں پر اس خاص قسم کی ''عقل'' اور ''مصلحت'' کی مذمت کرتا ہے جو انسانوں کو پستی اور مذلت کے دائرے میں محدود کرنے کے بعد انہیں وہاں پڑا رہنے پر مطمئن کر دیتی ہے اور انہیں یہ یقین دلا دیتی ہے کہ عیب اور شر کے اس مہلک دائرے کو توڑنا اور ایک خاص موقعے پر جست لگا کر وسیع اور منور فضاؤں کو پا لینے کی کوشش کرنا غیر عاقلانہ فعل ہے۔ ایسی ہی عقل رکھنے والے ناصحوں سے حافظ کہتا ہے:

نصیحتم چہ کنی، ناصحا چہ میدانی
کہ من نہ معتقدِ مردِ عافیت جویم

(اے ناصح تو مجھے کیا نصیحت کرتا ہے اور تو کیا جانتا ہے، میں عافیت تلاش کرنے والے شخص کا معتقد نہیں ہوں)

ایک رباعی میں حافظ نے اس بلند تر عقل کا ذکر کیا ہے جس کی رہنمائی وہ قبول

کرتا ہے۔ یہ عقل انسان میں حقیقت کی معرفت پیدا کر کے انہیں صحیح اور پر جوش عمل کی راہ پر آگے بڑھاتی ہے۔ عمل کی اس دانش مندانہ روش پر چلنے کے دوران میں جو تکالیف برداشت کرنا ہوتی ہیں ان سے قلب کی جلا ہوتی ہے اور وہ انسانوں کی روح میں چراغ روشن کر دیتی ہیں۔

راہ طلب تو خار غمہا دارد کو، راہروی کہ ایں قدمہا دارد
دانی تو کہ روشناس عقل است ان کو ہر چہرۂ جان چراغ غمہا دارد

(تیری طلب کی راہ میں کانٹے ہیں، ایسے (لائق تحسین) قدم اٹھانے والے کہاں ہیں؟ کیا تجھے معلوم ہے کہ عقل کا روشناس وہ ہے جس کے چہرۂ جان پر غموں کے چراغ روشن ہوتے ہیں)

علم و عمل کے اتحاد سے حقیقت کی پیہم جستجو اور اس کی بنیاد پر نئی اور بہتر زندگی کی تعمیر، انسانوں کو پستیوں اور مایوسیوں کی تاریک اور خشک وادیوں سے نکال کر مادّی اور روحانی ارتقا کے سرسبز و شاداب مرغزاروں کی طرف لے جاتی ہے۔ اس صبارک کاوش میں حقیقت کی ناشناسی سے پیدا ہونے والے شکوک اور الجھنیں کشف و یقین سے بدل جاتے ہیں۔

اس طریق عشق پر چلنے والوں کو اس کی صعوبتیں بھی راحتیں معلوم ہونے لگتی ہیں کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ مسافرت ان کے اور ان کے ساتھ چلنے والے رفقا کے شعور کو تیز اور ان کی قوتِ عمل میں پیہم اضافہ کرتی جا رہی ہے۔ امن و محبت کی جس نئی دنیا کے نصب العین کو سامنے رکھ کر وہ خارزاروں کو طے کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں، وہاں امید کی ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں اور ایک نئی زندگی اور نئے آدم کے جھلملاتے ہوئے ہیولے اور نقوش ان کی ہمت اور امنگ کو بڑھاتے ہیں۔ محبت اور حق کی اس راہ پر چلنا حافظ کے نزدیک، انسان کا بلند ترین منصب ہے:

در طریق عشق بازی امن و آسائش خطااست ریش باد آن دل کہ با دردِ تو جوید مرہمی
اہل کام و ناز را در کوئے رنداں راہ نیست رہروی باید جہانسوزے، نہ خامے بے غمی
آدم خاکی دریں عالم نمی آید بدست عالم دیگر بباید ساخت از نو آدمے

(عشق کے راستے میں آرام اور آسائش کی جستجو غلطی ہے۔ وہ دل زخمی ہو جائے جس میں تیرا درد ہو اور پھر وہ مرہم کی تلاش کرے! رندوں کے کوچے میں ہوس پرستوں اور مغروروں کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہاں کے رہرو کو جہاں سوز ہونا چاہئے نہ کہ خام اور بے غم۔ ہم اس دنیا میں (سچے اور اصلی) آدمی کی تلاش کرتے ہیں لیکن وہ نہیں ملتا، اس لئے ایک نئے آدم ایک دوسری دنیا

کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔)

حواشی:

ا۔ شاہ ابو اسحاق کے دور حکومت کے بارے میں حافظ نے کہا ہے:

راستی خاتمِ فیروزۂ بواسحاقی خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

(۱۵)

خواجہ حافظ شیرازی کو اپنی زندگی میں ہی قبولیت عام کا شرف حاصل ہوگیا تھا اور اس کے بعد کی تقریباً چھ صدیوں میں ان کی عظیم مقبولیت میں کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔

دوسری طرف ان پر پیہم حملے اور اعتراضات بھی ہوتے رہے ہیں۔ بعض علمانے ان پر کفر کے فتوے لگائے اور ایک روایت کے مطابق ان کی نماز جنازہ میں شرکت اور مسلمانوں کے قبرستان میں ان کی تدفین کو ممنوع قرار دیا۔

ایک دوسرے بزرگ ملا مگس نے شاہ اسمٰعیل صفوی سے یہ کہہ کر کہ خواجہ حافظ صحیح الایمان نہ تھے۔ مرزا حافظ کو تباہ کرادینے کی ترغیب دی لیکن انہیں کامیابی نہ ہوئی۔[۱]

اہل طریقت نے انہیں عجیب وغریب طریقے سے اپنایا یعنی اپنی مرضی اور منشا کے مطابق ان کے کلام کو معنی پہنائے جو اکثر حافظ کے منشا سے صریحاً مختلف معلوم ہوتے ہیں۔

مبتذل امرانے حافظ کے کلام کو اپنی سفلہ عیش پرستی کے جواز کے لئے استعمال کیا۔ اور ہمارے زمانے میں احیا پرستوں نے ان پر ''عجمیت'' کا مہمل اور بے معنی الزام لگا کر لوگوں کے دلوں سے حافظ کے لئے انس وعقیدت کو کم کرنے کی کوشش کی۔

حافظ سے ان تمام گروہوں کا اختلاف ہماری سمجھ میں آسکتا ہے، اس لئے کہ بالآخر شعرِ حافظ حیات انسانی کے انہیں منفی رجحانات کی مذمت کرتا ہے جن کے یہ حضرات داعی ہیں۔

مجھے امید ہے کہ اوپر لکھی ہوئی سطریں خواجہ حافظ کے متعلق ان غلط فہمیوں کو دور کرنے میں کسی قدر مددگار ثابت ہوں گی جو معلوم ہوتا ہے کہ روشن خیال حلقوں میں بھی بعض عناصر میں موجود ہیں۔ روشن خیال دانشوروں کی جگہ اہل نظر کی اس کثیر جماعت میں ہے جن کے دل میں بجا طور پر حافظ کے لئے گہری اور پرخلوص عقیدت ہے۔ اس لئے کہ شیراز کے اس جادوگر نے زندگی کو محبت کے لافانی نغموں اور امید کی سنہری کرنوں سے بھر دیا ہے۔ حافظ نے ایک جگہ جذبۂ

محبت سے مسحور ہو کر کہا ہے:

ندائی عشق تو دوشم در اندرون دادند
فضائے سینۂ حافظ ہنوز پر ز صدا است

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حافظ کی ندائے عشق، چھ سو برس بیت جانے کے بعد، آج بھی اپنی پہلی سی شیرینی اور حرارت کے ساتھ بے شمار لوگوں کے سینوں میں گونج رہی ہے، اور اس وقت تک گونجتی رہے گی جب تک انسان ایک دوسرے سے محبت کرتے رہیں گے۔

حواشی:

ا۔ یہ واقعہ براؤن نے اپنی کتاب ''تاریخ ادبیات ایران'' (جلد دوم) میں رسالہ ''لطیفہ غیبیہ'' کے حوالے سے لکھا ہے۔

انتخابِ غزلیات

خواجہ حافظ شیرازی

خواجہ حافظ کی غزلیات کا یہ انتخاب پڑھنے والوں کی آسانی کے لئے پیش کیا جارہا ہے۔
کتاب کے ساتھ ساتھ اگر ان اشعار پر نظر ڈال لی جائے تو قاری میری معروضات کے متعلق خود اپنی رائے قائم کر سکتے ہیں۔

یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ حافظ کا یہ انتخاب میرے نزدیک مکمل نہیں ہے۔ البتہ ان اشعار کو کلام حافظ کا ایک بہترین حصہ ضرور شمار کیا جاسکتا ہے۔

یہ انتخاب دیوان حافظ کے اس نسخے سے کیا گیا ہے جو علامہ محمد قزوینی اور ڈاکٹر قاسم غنی کے زیر اہتمام تہران سے شائع ہوا ہے یہی اس وقت تک دیوان حافظ کا سب سے مستند نسخہ ہے۔

سجاد ظہیر

(الف)

بمی سجادہ رنگین کن گرت پیر مغان گوید　　که سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا
شبِ تاریک وبیمِ موج وگردابے چنین حائل　　کجا دانند حالِ ما سبکبارانِ ساحلہا

—

صلاحِ کار کجا و من خراب کجا　　ببیں تفاوت رہ کز، کجا است تا بہ کجا
دلم ز صعومہ بگرفت و خرقۂ سالوس　　کجاست دیرِ مغان و شراب ناب کجا

—

ہنگامِ تنگ دستی در عیش کوش و مستی　　کایں کیمیائی ہستی قارون کند گدارا
ہمہ شب دریں اُمیدم کہ نسیم صبحگاہی　　بہ پیام آشایاں بنوا زد آشنارا

—

راز درونِ پردہ ز رندان مست پرس　　کاین حال نیست زاہد عالی مقام را
اے دل شباب رفت و نچیدی گلی زعیش　　پیرانہ سر مکن ہنری ننگ و نام را
در عیش نقد کوش کہ چوں آبخور نماند　　آدم بہشت روضۂ دارالسلام را

—

حافظا می خور و رندی کن و خوش باش ولی　　دامِ تزویر مکن چون دگران قرآن را

—

ساقی بنور بادہ بر افروز جام ما　　مطرب بگو کہ کارِ جہاں شد بکام ما
ما در پیالہ عکس رخِ یار دیدہ ایم　　اے بیخبر ز لذّتِ مُشرب مدام ما
ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق　　ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

—

صبا بلطف بگو آں غزال رعنا را که سر بکوه و بیاباں تو دادهٔ ما را
شکر فروش که عمرش دراز باد چرا تفقدی نکند طوطی شکر خارا
غرور حسنت اجازت مگر نداد ای گل که پرسشی نکنی عندلیب شیدا را
بخلق و لطف توان کرد صید اہل نظر ببند و دام نگیرند مرغ دانا را
ندانم از چه سبب رنگ آشنائی نیست سہی قدان سیه چشم ماه سیمارا
چون با حبیب نشینی و باده پیمائی بیاد دار محبان باد پیمارا
جز این قدر نتواں گفت در جمال تو عیب که وضع مہر و وفا نیست روئی زیبارا

در آسماں نه عجب گر بگفتهٔ حافظ
سرود زہره برقص آورد مسیحا را

—

ساقیا برخیز و در ده جام را خاک برسرکن غمِ ایام را
ساغر مے برکفم نه تا زبر برکشم این دلق ازرق فام را
گرچه بدنامیست نزد عاقلان ما نمی خواہیم ننگ و نام را
باده در ده چند این باد غرور خاک برسر نفس نا فرجام را
دود آهِ سینهٔ نالان من! سوخت این افسردگان خام را
محرم رازِ دل شیدائے خود کس نمی بینم ز خاص و عام را
باد لا را می مرا خاطر خوش است کنز دلم یکباره برد آرام را
ننگرو دیگر بسر و اندر چمن ہرکه دید آں سرو سیم اندام را

صبر کن حافظ بسختی روز و شب
عاقبت روزی بیابی کام را

—

(ب)

می دمد صبح و کله بست سحاب الصبوح الصبوح یا اصحاب
می چکد ژاله بر رخ لاله، المدام المدام یا احباب
می وزد از چمن نسیم بہشت ہاں نبوشیدم بدم می ناب

تخت زمرد ز دست گل بہ چمن   راح چوں لعل آتشیں دریاب
در میخانہ بستہ اند دگر   اِفتح یا مفتّح الابواب
لب و دندانت را حقوق نمک   ہست برجان و سینہ ھائے کباب
این چنیں موسمی عجب باشد   کہ ببندند میکدہ بشتاب

بر رخ ساقی پری پیکر
ہمچو حافظ بنوش بادۂ ناب

—

(ت)

بنود نقش دو عالم کہ رنگ الفت بود   زمانہ طرح محبت نہ ایں زماں انداخت

—

زاہد غرور داشت سلامت نبرد راہ   رند از رہ نیاز بہ دارالسلام رفت
نقد دلے کہ بود مرا صرف بادہ شد   قلب سیاہ بود از آں در حرام رفت

در تاب توبہ چند تواں سوخت ہمچو عود
می دہ کہ عمر در سر سودائے خام رفت

—

شکر ایزد کہ ز تاراج خزاں رخنہ نہ یافت   بوستانِ سمن و سرو و گل و شمشادت

—

سینہ از آتش دل در غم جانا نہ بسوخت   آتشی بود دریں خانہ کہ کاشانہ بسوخت
تنم از واسطہ دوری دلبر بگداخت   جانم از آتش مہر رخ جانا نہ بسوخت
سوز دل بین کہ ز بس آتش اشکم دل شمع   دوش برمن ز سر مہر چو پروانہ بسوخت
آشنائی نہ غریبست کہ دل سوز منست   چوں من از خویش برفتم دل بیگانہ بسوخت
ترک افسانہ بگو حافظ و می نوش دمی   کہ نخفتیم شب و شمع با افسانہ بسوخت

—

اساس توبہ کہ در محکمی چو سنگ نمود   ببیں کہ جام زجاجی چہ طرفہ اش بشکست
مقام عیش میسر نمیشود بے رنج   بلی بحکم بلابستہ اند عہد الست

—

گہ خمر بہشتست بریزید کہ بیدوست — ہر شربت عذبم کہ دہی عین عذابست
در کنج دماغم مطلب جائی نصیحت — کایں گوشہ پر از زمزمہ جنگ وربابست
حافظ چہ شد از عاشق و رندست ونظرباز — بس طور عجب لازم ایام شبابست

من نخواہم کرد ترک لعل یار و جام مے
زاہداں معذور داریدم کہ اینم مذہبست

—

یک قصہ بیش نیست غم عشق ویں عجب
کز ہر زباں کہ میشنوم نا مکرّر است

آن شد اکنوں کہ زا بنائے عوام اندیشم — محتسب نیز دریں عیش نہانی دانست
دلبرآسایش ما مصلحت وقت ندید — ورنہ از جانب ما دل نگرانی دانست
بر در میخانہ رفتن کار یک رنگاں بود — خودفروشاں را بکوئی می فروشاں راہ نیست
بندۂ پیر خراباتم کہ لطفش دائم است — ورنہ لطف شیخ و زاہد گاہ ہست و گاہ نیست

—

عشق بازی را تحمل باید اے دل پاے دار — گر ملالی بود بود و گر خطائی رفت رفت

—

امروز کہ در دست توام مرحمتی کن — فردا کہ شوم خاک چہ سود اشک ندامت
حاشا کہ من از جور و جفای تو بنالم — بیداد لطیفان ہمہ لطفست و کرامت

—

صبحدم مرغ چمن باگل نوخاستہ گفت — نازکم کن کہ دریں باغ بسی چوں تو شگفت
گل نخندید کہ از راست نرنجیم ولی — ہیچ عاشق سخنِ سخت بمعشوق نگفت

—

اے نسیم سحر آرامگہ یار کجاست — منزل آں مہ عاشق کش عیار کجاست
شب تاراست وره وادیٔ ایمن در پیش — آتش طور کجا موعد دیدار کجاست
ہرکہ آمد بجہاں نقش خرابی دارد — در خرابات بگوئید کہ ہشیار کجاست
آنست اہل بشارت کہ اشارت داند — نکتہا ہست بسی محرم اسرار کجاست

ہر سر موئی مرابا تو ہزاراں کارست ما کجائیم و ملامت گر بیکار کجاست
باز پرسید زگیسوئی شکن در شکنش کایں دل غمزدہ سرگشتہ گرفتار کجاست
عقل دیوانہ شد آں سلسۂ مشکیں کو دل ز ما گوشہ گرفت ابروی دلداد کجاست
ساقی و مطرب و مئے جملہ مہیاست ولے عیش بے یار مہیّا نشود یار کجاست

حافظ از باد خزاں در چمن دہر مرنج
فکر معقول بفرما گل بے خار کجاست

—

روزہ یکسو شد و عید آمد و دلہا برخاست مَیِ زخمخانہ بجوش آمد و می باید خواست
توبۂ زہد فروشان گراں جاں بگوشت وقت رندی وطرب کردن رنداں پیداست
چہ ملامت بود آنرا کہ چنیں بادہ خورد ایں چہ عیبست بدین بیخردی ویں چہ خطاست
بادہ نوشی کہ درو روی دریائی بنود بہتر از زہد فروشی کہ درو روی و ریاست
ما نہ رندان ریائیم و حریفان نفاق آنکہ او عالم سرست بدیں حال گواست
فرض ایزد بگذاریم و بکس بد نکنیم وانچہ گویند روانیست نگوئیم رواست
چہ شود گر من و توچند قدح بادہ خوریم بادہ از خون رزانست نہ از خون شماست

ایں چہ عیب ست کزاں عیب خلل خواہد بود
در بود نیز چہ شدم مردم بے غیب کجا ست

—

چو بشنویٔ سخن اہل دل مگو کہ خطاست سخن شناس نۂ جان من خطا اینجاست
سرم بدنیٰ و عقبٰی فرو نمی آید تبارک اللہ ازیں فتنہا کہ در سر ماست
در اندرون من خستہ دل ندانم کیست کہ من خموشم و او در فغان و در غوغاست
دلم ز پردہ بروں شد کجائیٔ اے مطرب بنال ہاں کہ ازیں پردہ کار مانبو است
مرا بکار جہاں ہرگز التفات نبود رخ تو در نظر من چنیں خوشش آراست
نخفتہ ام ز خیالی کہ می پزد دل من خمار صد شبہ دارم شرابخانہ کجاست
چنیں کہ صومعہ آلودہ شد ز خون دلم گرم بادہ بشوئید حق بدست شماست
ازآں بدیر مغانم عزیز می دارند کہ آتشے کہ نمیرد ہمیشہ در دل ماست

چہ ساز بود کہ در پردہ میزد آں مطرب   کہ رفت عمرو ہنوزم دماغ پر ز ہواست
ندای عشق تو دیشب دراندروں دادند
فضائی سینۂ حافظ ہنوز پر ز صداست

—

زلف آشفتہ وخوی کردہ وخنداں لب ومست   پیرہن چاک وغزلخوان وصراحی در دست
نرگسش عربدہ جوی ولبش افسوس کناں   نیم شب دوش ببالیں من آمد بنشست؛
سرفراگوش من آورد بآواز حزیں   گفت اے عاشق دیرینۂ من خوابت ہست
عاشقی را کہ چنیں بادہ شبگیر دہند   کافر عشق بود گر نشود بادہ پرست
بروای زاہد و بردرد کشاں خردہ مگیر   کہ ندادند جز ایں تحفہ بما روز الست
آنچہ او ریخت بہ پیمانہ ما نوشیدیم   اگر از خمر بہشتست و گر بادۂ مست
خندۂ جام می و زلف گرہ گیر نگار
اے بسا توبہ کہ چوں توبۂ حافظ بشکست

—

خدا چو صورت ابروئ دلکشائی تو بست   گشاد کار من اندر کرشمہای تو بست
مرا و سرو چمن را بخاک راہ نشاند   زمانہ تا قصب نرگس قبای تو بست
ز کار ما و دل غنچہ صد گرہ بکشود   نسیم گل چو دل اندر پی ہوای تو بست
مرا بہ بند تو دوران چرخ راضی کرد   ولی چہ سود کہ سر رشتہ در رضای تو بست
چو نافہ بردل مسکین من گرہ مفگن   کہ عہد باسر زلف گرہ کشای تو بست
تو خود وصال دگر بودی اے نسیم وصال   خطا نگر کہ دل امید در وفای تو بست
ز دست جور تو گفتم ز شہر خواہم رفت
بخندہ گفت کہ حافظ برو کہ پای تو بست

—

المنۃ للّٰلہ کہ در میکدہ بازست   زاں رو کہ مرا بر دراو روی نیاز ست
خمہا ہمہ در جوش و خروشند زمستی   واں می کہ درآنجاست حقیقت نہ مجازست
ازوی ہمہ مستی و غرورست و تکبر   وزما ہمہ بیچارگی و عجز و نیازست

رازی کہ برغیر نگفتیم و نگوئیم   بادوست بگوئیم کہ او محرم رازست
شرح شکن زلف خم اندر خم جاناں   کوتہ نتواں کرد کہ ایں قصہ درازست
بار دل مجنون و خم طرّۂ لیلیٰ   رخسارۂ محمود و کف پائے ایازست
بر دوختہ ام دیدہ چو باز از ہمہ عالم   تادیدۂ من بر رخ زیبای تو بازست
در کعبۂ کوئی تو ہر آنکس کہ بیاید   از قبلۂ ابروی تو در عین نمازست

اے مجلسیاں سوز دل حافظ مسکین
از شمع پرسید کہ در سوز و گدازست

—

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گل بیزست   ببانگ چنگ مخورمے کہ محتسب تیزست
صرائی و حریفی گرت بچنگ افتد   بعقل نوش کہ ایام فتنہ انگیزست
در آستین مرقع پیالہ پنہاں کن   کہ ہمچو چشم صراحی زمانہ خونریزست
بآب دیدہ بشوئیم خرقہا از می   کہ موسم ورع و روزگار پرہیزست
مجوی عیش خوش از دور باژگوں سپہر   کہ صاف ایں سرخم جملہ دردی آمیزست
سپہر برشدہ پرویز نیست خوں افشاں   کہ ریزہ اش سرکسری و تاج پرویزست

عراق و فارس گرفتی بشعر خوش حافظ
بیا کہ نوبت بغداد و وقت تبریزست

—

صحن بستاں ذوق بخش وصحبت یاران خوشست   وقت گل خوش باد کزوی وقت میخواراں خوشست
از صبا ہردم مشام جان ما خوش میشود   آری آری طیب انفاس ہواداراں خوشست
ناگشودہ گل نقاب آہنگ رحلت ساز کرد   نالہ کن بلبل کہ گلبانگ دل افکاراں خوشست
مرغ خوشخواں را بشارت باد کاندرراہ عشق   دوست را بانالۂ شبہائے بیداراں خوشست
نیست در بازار عالم خوشدلی ورزانکہ ہست   شیوۂ رندی و خوشباشی عیاراں خوشست
از زبان سوسن ایں آزادہ ام آمد بگوش   کاندریں دیر کہن کار سبکباراں خوشست

حافظا ترک جہاں گفتن طریق خوشدلیست
تاپنداری کہ احوال جہانداراں خوشست

—

درین زمانہ رفیقی کہ خالی از خللست　　صراحی می ناب و سفینۂ غزلست
جریدہ رو کہ گزرگاہ عافیت تنگست　　پیالہ گیر کہ عمر عزیز بی بدل ست
نہ من ز بی عملی درجہاں ملولم و بس　　ملالت علما ہم ز علم بی عمل ست
بچشم عقل دریں رہگذار پر آشوب　　جہان و کار جہاں بی ثبات و بی محل ست
بگیر طرۂ مہ چہرۂ و قصہ مخواں　　کہ سعد و نحس ز تاثیر زہرہ و زحل ست
دلم امید فراواں بہ وصل روی تو داشت　　ولی اجل برہ عمر رہزن امل است

ہیچ دور نخواہند یافت ہشیارش
چنیں کہ حافظ ما مست بادۂ ازل است

—

بنال بلبل اگر بامنت سریاریست　　کہ ما دو عاشق زاریم و کار مازاریست
درآں زمیں کہ نسیمے وزد ز طرّہ دوست　　چہ جائے دم ز دن نافہائے تاتاریست
بیار بادہ کہ رنگیں کنیم جامۂ زرق　　کہ مست جام غروریم و نام ہشیاریست
خیال زلف تو پختن نہ کار ہر خامیست　　کہ زیر سلسلہ رفتن طریق عیاریست
لطیفہ ایست نہانی کہ عشق از و خیزد　　کہ نام آں نہ لب لعل و خط ز نگاریست
جمال شخص نہ چشم ست و زلف و عارض و خال　　ہزار نکتہ دریں کاروبار دلداریست
قلندران حقیقت بہ نیم جو نخرند　　قبائے اطلس آنکس کہ از ہنر عاریست
برآستان تو مشکل تواں رسید آری　　عروج برفلک سروری بدشواریست
سحر کرشمۂ چشمت بخواب میدیدم　　زہی مراتب خوابی کہ بہ ز بیداریست

دلش بنالہ میازار و ختم کن حافظ
کہ رستگای جاوید در کم آزاریست

—

رہیست راہ عشق کہ ہیچش کنارہ نیست　　آنجا جز آنکہ جان بسپارند چارہ نیست
ہرگہ کہ دل بعشق دہی خوش دمی بود　　درکار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست
مارا ز منع عقل مترسان و می بیار　　کاں شحنہ در ولایت ما ہیچ کارہ نیست
از چشم خود بپرس کہ مارا کہ می کشد　　جاناں گناہ طالع و جرم ستارہ نیست

اورا بچشم پاک تواں دید چوں ہلال　　ہر دیدہ جای جلوۂ آں ماہ پارہ نیست
فرصت شمر طریقۂ رندی کہ ایں نشاں　　چوں راہ گنج برہمہ کس آشکارہ نیست

نگرفت در تو گریۂ حافظ بہیچ رو
حیران آں دلم کہ کم از سنگ خارہ نیست

—

حاصل کارگہ کون و مکاں ایں ہمہ نیست　　بادہ پیش آر کہ اسباب جہان ایں ہمہ نیست
از دل و جان شرف صحبت جاناں غرضست　　غرض اینست وگرنہ دل و جان ایں ہمہ نیست
منت سدرہ و طوبیٰ ز پے سایہ مکش　　کہ چوں خوش بنگری اے سرو رواں ایں ہمہ نیست
دولت آنست کہ بی خون دل آید بکنار　　ورنہ باسعی و عمل باغ جناں ایں ہمہ نسیت
پنج روزی کہ دریں مرحلہ مہلت داری　　خوش بیاسائے زمانی کہ زماں ایں ہمہ نسیت
بر لب بحر فنا منتظریم ای ساقی　　فرصتی داں کہ زلب تا بدہاں ایں ہمہ نیست
زاہد ایمن مشو از بازی غیرت زنہار　　کہ رہ از صومعہ تا دیر مغاں ایں ہمہ نیست
دردمندیِ من سوختہ زار و نزار　　ظاراً حاجت تقریر و بیاں ایں ہمہ نیست

نام حافظ رقم نیک پذیرفت ولی
پیش رندان رقم سود و زیاں ایں ہمہ نیست

—

شربتی از لب لعلش نچشیدیم وبرفت　　روئے مہ پیکر او سیر ندیدیم و برفت
گوئیٔ از صحبت مانیک بتنگ آمدہ بود　　بار بربست و بگردش نرسیدیم و برفت
بس کہ مافاتحہ و حرزیمانی خواندیم　　وز پیش سورۂ اخلاص دمیدیم و برفت
عشوہ دادند کہ برما گذری خواہی کرد　　دیدی آخر کہ چنیں عشوہ خریدیم و برفت
شد چماں در چمن حسن و لطافت لیکن　　در گلستان وصالش نچمیدیم و برفت

ہمچو حافظ ہمہ شب نالہ و زاری کردیم
کای دریغا بہ وداعش نرسیدیم و برفت

(د)

خون شد دلم بیاد تو ہرگہ کہ در چمن　　بند قبای غنچۂ گل میکشاد باد

—

برو معالجہ خود کن اے نصیحت گو   شرب و شاہد شیریں کرا زیانی داد

—

کسے کہ حسن و خطِ دوست در نظر دارد   محققست کہ او حاصل بصر دارد

—

نہ ہر درخت تحمل کند جفای خزاں   غلام ہمت سردم کہ ایں قدم دارد

در عاشق میشدم گفتنم کہ بردم گوہر مقصود
ندانستم کہ ایں دریا چہ موج خونفشانی دارد

ماہ خورشید نمایش ز پس پردۂ زلف   آفتابیست کہ در پیش سحابی دارد

کی کند سوئی دل خستۂ حافظ نظری   چشم مستش کہ بہر گوشہ خرابی دارد

—

شب تنہائیم در قصد جاں بود   خیالش لطفہائے بیکراں کرد

میانِ مہرباناں کی تواں گفت   کہ یار ما چنیں گفت و چناں کرد

—

روز در کسب ہنر کوش کہ می خوردن روز   دل چو آئینہ در زنگ ظلام اندازد

—

عشق و شباب و رندی مجموعۂ مرادست   چوں جمع شد معانی گوئی بیاں تواں زد

—

نقد صوفی نہ ہمہ صافی بیغش باشد   اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

ناز پرورد تنعم نبرد راہ بدوست   عاشقی شیوۂ رندان بلاکش باشد

—

رسید مژدہ کہ ایام غم نخواہد ماند   چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

غنیمتی شمر ای شمع وصل پروانہ   کہ ایں معاملہ تا صبحدم نخواہد ماند

ز مہربانی جانان طمع مبر حافظ   کہ نقش جور و نشان ستم نخواہد ماند

—

آناں کہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند   آیا بود کہ گوشہ چشمے بما کنند

—

گفتم غم تو دارم گفتا غمت سر آید　　گفتم کہ ماہِ من شو گفتا اگر بر آید
گفتم ز مہر ورزاں رسم وفا بیاموز　　گفتا ز خوبرویان این کار کمتر آید
گفتم کہ برخیالت راہ نظر ببندم　　گفتا کہ شب روست او از راہِ دیگر آید
گفتم کہ بوئے زُلفت گمراہ عالمم کرد　　گفتا اگر بدانی ہم اوت رہبر آید
گفتم خوشا ہوائے کز باد صبح خیزد　　گفتا خنک نسیمے کز کوئی دلبر آید
گفتم کہ نوش لعلت مارا بہ آرزو کشت　　گفتا تو بندگی کن کو بندہ پرور آید
گفتم دلِ رحیمت کے عزمِ صلح دارد　　گفتا مگوئی باکس تاوقت آں در آید

گفتم زمانِ عشرت دیدی کہ چوں سرآمد
گفتہ خموش حافظ کایں غصہ ہم سر آید

خدا را محتسب مارا بفریاد دف و نی بخش　　کہ ساز شرع ازیں افسانہ بی قانون نخواہد شد
مجال من ہمیں باشد کہ پنہاں عشق او ورزم　　کنار و بوس و آغوشش چگویم چوں نخواہد شد
شراب لعل و جائے امن و یار مہرباں ساقی　　دلا کی بہ شود کارت اگر اکنون نخواہد شد

چوں می از خم بہ سبو رفت و گل افگند نقاب　　فرصت عیش نگہ دار و بزن جامی چند
زاہد از کوچۂ رنداں بسلامت بگذر　　تاخرابت نکند صحبت بدنامی چند

عیب می جملہ چو گفتی ہنرش نیز بگو
نفی حکمت مکن از بہر دل عامی چند

کمال سر محبت ببیں نہ نقص گناہ　　کہ ہر کہ بی ہنر افتد نظر بعیب کند

زاہد از رندیٔ حافظ نکند فہم چہ شد　　دیو بگریزد از آں قوم کہ قرآن خوانند

من ارچہ عاشقم و رند و مست و نامہ سیاہ　　ہزار شکر کہ یاران شہر بی گنہند
جفا نہ پیشۂ درویشیت و راہروی　　بیار بادہ کہ ایں سالکان نہ مرد رہند

میں حقیر گدایان عشق را کایں قوم　　شہان بے کمر و خسروان بی کلہند
غلام ہمت دردیٔ کشاں یک رنگم　　نہ آں گروہ کہ ازرق لباس و دل سیہنند
جناب عشق بلندست ہمتی حافظ
کہ عاشقاں رہ بے ہمتاں بخود ندہند

—

خیرہ آں دیدہ کہ آبش نبرد گریہ عشق　　تیرہ آں دل کہ در و شمع محبت نبود

—

گفتم کیم دہان و لبت کامران کنند　　گفتا بچشم ہرچہ تو گوئی چنان کنند
گفتم خراج مصر طلب میکند لبت　　گفتا درین معاملہ کمتر زیان کنند
گفتم ہوای میکدہ غم میبرد ز دل　　گفتا خوش آن کسان کہ دلی شادمان کنند

—

ز احترام نظر سعد در رہست کہ دوش　　میان ماہ و رخ یار من مقابلہ بود
دہان یار کہ در مانِ درد حافظ داشت　　فغاں کہ وقت مروّت چہ تنگ حوصلہ بود

—

مکن بچشم حقارت نگاہ در من مست　　کہ آب روئے شریعت بدیں قدر نرود

—

روز وصل دوستداران یاد باد　　یاد باد آں روزگاران یاد باد
کامم از تلخیِ غم چوں زہر گشت　　بانگ نوش شاد خواران یاد باد
گرچہ یاران فارغند از یاد من　　از من ایشانرا ہزاران یاد باد
مبتلا گشتم درین بند و بلا　　کوشش آں حق گزاران یاد باد
گرچہ صدر دوست در چشم مدام　　زندہ رود باغ کاران یاد باد
راز حافظ بعد ازیں ناگفتہ ماند
ای دریغا راز داران یاد باد

—

حُسن تو ہمیشہ در فزوں باد　　رویت ہمہ سالہ لالہ گوں باد

اندرِ سرِ ما خیال عشقت — ہر روز کہ باد در فزوں باد
ہر سرو کہ در چمن در آید — در خدمت قامت نگوں باد
چشمی کہ نہ فتنۂ تو باشد — چوں گوہر اشک غرق خوں باد
چشم تو ز بہر دلربائی — در کردن سحر ذو فنون باد
ہر جاکہ دلیست در غم تو — بے صبر و قرار و بے سکوں باد
قدِ ہمہ دلبران عالم — پیش الف قدت چونوں باد
ہر دل کہ ز عشق تست خالی — از حلقۂ وصل تو بروں باد

لعل تو کہ ہست جان حافظ
دور از لب مردمان دوں باد

—

آنکہ رخسار ترا رنگ گل و نسریں داد — صبر و آرام تواند بمن مسکیں داد
وانکہ گیسوئے ترا رسم تطاول آموخت — ہم تواند کرمش داد من غمگیں داد
من ہماں روز فرہاد طمع ببریدم — کہ عنان دل شیدا بلب شیریں داد
گنج زر گر نبود گنج قناعت باقیست — آنکہ آن داد بشاہان بگدایان ایں داد
خوش عروسیست جہان از رہ صورت لیکن — ہر کہ پیوست بدو عمر خودش کاویں داد
بعد ازیں دست من و دامن سرو لب جو — خاصہ اکنوں کہ صبا مژدہ فرور دیں داد

در کف غصۂ دوراں دل حافظ خوں شد
از فراقِ رخت اے خواجہ قوام الدّین داد

—

دل ما بدور رویت ز چمن فراغ دارد — کہ چو سرو پاے بندست و چو لالہ داغ دارد
سرما فرو نیاید بکمان ابروئی کس — کہ درون گوشہ گیراں ز جہاں فراغ دارد
ز بنفشہ تاب دارم کہ ز زلف او زندم — تو سیاہ کم بہا بیں کہ چہ در دماغ دارد
بچمن خرام و بنگر بر تخت گل کہ لالہ — بندیم شاہ ماند کہ بکف ایاغ دارد
شب ظلمت و بیاباں بکجا تواں رسیدن — مگر آں کہ شمع رویت برہم چراغ دارد
من و شمع صبحگاہی سزد ار بہم بگیریم — کہ بسوختیم و از ما بت ما فراغ دارد

سزدم چو ابر بہمن کہ بریں چمن بگریم طرب آشیان بلبل بنگر کہ زاغ دارد

سر درس عشق دار دل درد مند حافظ
کہ نہ خاطر تماشا نہ ہوائے باغ دارد

—

آنکس کہ بدست جام دارد سلطانی جم مدام دارد
آبی کہ خضر حیات ازو یافت در میکدہ جو کہ جام دارد
سررشتۂ جان بجام بگذار کایں رشتہ ازو نظام دارد
ماوی و زاہدان و تقوی تا یار سر کدام دارد
بیرون ز لب تو ساقیا نیست در دور کسی کی کام دارد
ذکر رخ و زلف تو دلم را دردیست کہ صبح و شام دارد
بر سینۂ ریش درد منداں لعلت نمکی تمام دارد

در چاہ ذقن چو حافظ اے جاں
حسن تو دو صد غلام دارد

—

ہر آنکو خاطر مجموع و یار نازنیں دارد سعادت ہمدم او گشت و دولت ہم نشیں دارد
حریم عشق را درگہ بسی بالاتر از عقلست کسے آں آستاں بوسد کہ جاں در آستیں دارد
دہان تنگ شیرینش مگر ملک سلیمانست کہ نقش خاتم لعلش جہاں زیر نگیں دارد
لب لعل و خط مشکیں چو آنش ہست وانیش ہست بنازم دلبر خود را کہ حسنش آں و ایں دارد
بخواری منگرای منعم ضعیفان و نحیفاں داں کہ صدر مجلس عشرت گدائے رہ نشیں دارد
چو بر روی زمیں باشی توانائی غنیمت داں کہ دوراں ناتو انیھا بسے زیر زمیں دارد
بلاگردان جان و تن دعای مستمندانست کہ بیند خیر از آں خرمن کہ ننگ از خوشہ چیں دارد
صبا از عشق من رمزی بگو با آں شہ خوباں کہ صد جمشید و کیخسرو غلام کمتریں دارد

دگر گوید نمیخواہم چو حافظ عاشق مفلس
بگوئیدش کہ سلطانی ؟ گدائی ہم نشیں دارد

—

چو باد عزم سرکوئی یار خواهم کرد　　نفس ببوئے خوشش مشکبار خواهم کرد
بہر زہ بی می و معشوق عمر میگذرد　　بطالتم بس از امروز کار خواهم کرد
ہر آب روئے کہ اندوختم ز دانش و دیں　　نثار خاک رہ آں نگار خواهم کرد
چو شمع صبحدمم شد ز مہر او روشن　　کہ عمر در سر ایں کاروبار خواهم کرد
بیاد چشم تو خود را خراب خواہم ساخت　　بنای عہد قدیم استوار خواهم کرد
صبا کجاست کہ ایں جان خوں گرفتہ چوگل　　فدای نکہت گیسوئے یار خواهم کرد

نفاق و زرق بخشد صفای دل حافظ
طریق رندی و عشق اختیار خواهم کرد

—

دوستاں دختر رز توبہ ز مستوری کرد　　شد سوئے محتسب و کار بدستوری کرد
آمد از پردہ بمجلس عرقش پاک کنید　　تانگویند حریفاں کہ چرا دوری کرد
مژدگانی بدہ ای دل کہ دگر مطرب عشق　　راہ مستانہ زد و چارۂ مخموری کرد
نہ بہفت آب کہ رنگش بصد آتش نرود　　آنچہ باخرقۂ زاہد می انگوری کرد
غنچۂ گلبن و صلم ز نسیمش بشگفت　　مرغ خوشخواں طرب از برگ گل سوری کرد

حافظ افتادگی از دست مدہ زانکہ حسود
عرضِ مال و دل و دیں در سر مغروری کرد

—

دمی باغم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد　　بمی بفروش دلق ماکزیں بہتر نمی ارزد
بکوئی مے فروشانش بجا می بر نمی گیرند　　زہے سجادۂ تقوی کہ یک ساغر نمی ارزد
رقیبم سرزنشہا کرد کز ایں باب رخ برتاب　　چہ افتاد ایں سر مارا کہ خاکِ در نمی ارزد
شکوہ تاج سلطانی کہ بیم جاں درو درجست　　کلاہی دلکش است امّا بہ ترکِ سر نمی ارزد
چہ آساں می نمود اوّل غم دریا ببوئے سود　　غلط کردم کہ ایں طوفاں بصد گوہر نمی ارزد
ترا آں بہ کہ روی خود زمشتاقان بپوشانی　　کہ شادی جہانگیری غم لشکر نمی ارزد

چو حافظ در قناعت کوش وز دنیائے دوں بگذر
کہ یک جو منت دوناں دو صد من زر نمی ارزد

—

خوش آمد گل و زاں خوشتر نباشد	کہ در دستت بجز ساغر نباشد
زمان خوشدلی دریاب و دریاب	کہ دایم در صدف گوہر نباشد
غنیمت داں و می خور در گلستاں	کہ گل تا ہفتۂ دیگر نباشد
ایا پر لعل کردہ جام زرین	بہ بخشا بر کسی کش زر نباشد
بیا اے شیخ و از خمخانۂ ما	شرابی خور کہ در کوثر نباشد
بشوئی اوراق اگر ہمدرس مائی	کہ علم عشق در دفتر نباشد
زمن بینوش و دل در شاہدی بند	کہ حسنش بستۂ زیور نباشد
شرابی بی خمارم بخش یارب	کہ باوی ہیچ درد سر نباشد
من از جاں بندۂ سلطاں اویسم	اگرچہ یادش از چاکر نباشد
بتاج عالم آرایش کہ خورشید	چنیں زیبندۂ افسر نباشد

کسے گیرد خطا بر نظم حافظ
کہ ہیچش لطف در گوہر نباشد

—

گل بے رخ یار خوش نباشد	بی بادہ بہار خوش نباشد
طرف چمن و طواف بستاں	بی لالہ عذار خوش نباشد
رقصیدن سرد و حالت گل	بی صوت ہزار خوش نباشد
مایار شکر لب گل اندام	بی بوس و کنار خوش نباشد
ہر نقش کہ دست عقل بندد	جز نقش نگار خوش نباشد

جاں نقد محقرست حافظ
از بہر نثار خوش نباشد

—

نفس باد صبا مشک فشاں خواہد شد	عالم پیر دگر بارہ جواں خواہد شد
ارغواں جام عقیقی بسمن خواہد داد	چشم نرگس بشقایق نگراں خواہد شد
ایں تطاول کہ کشید از غم ہجراں بلبل	تا سرا پردۂ گل نعرہ زناں خواہد شد
گرد مسجد بخرابات شدم خردہ مگیر	مجلس وعظ درازست و زماں خواہد شد

ای دل ار عشرت امروز بفردا فکنی — مایۂ نقد بقا را کہ ضماں خواہد شد
ماہ شعباں منہ از دست قدح کایں خورشید — از نظر تا شب عید رمضاں خواہد شد
گل عزیزست غنیمت شمریدش صحبت — کہ بباغ آمد ازیں راہ از آں خواہد شد
مطربا مجلس انست غزل خوان و سرود — چند گوئی کہ چنیں رفت و چناں خواہد شد

حافظ از بہر تو آمد سوئے اقلیم وجود
قدمی نہ بوداعش کہ رواں خواہد شد

—

روز ہجران و شب فرقت یار آخر شد — زدم ایں فال وگزشت اختر و کار آخر شد
آں ہمہ ناز و تنعم کہ خزاں می فرمود — عاقبت در قدم باد بہار آخر شد
صبح امید کہ بُد معتکف پردۂ غیب — گو بروں آی کہ کار شب تار آخر شد
شکر ایزد کہ با اقبال کلہ گوشہ گل — نخوت باددی و شوکتِ خارآخر شد
آں پریشانی شبہای دراز و غم دل — ہمہ در سایۂ گیسوئے نگار آخر شد
باورم نیست ز بد عہدیٔ ایام ہنوز — قصۂ غصہ کہ در دولت یارآخر شد
ساقیا لطف نمودی قدحت پُر می باد — کہ بتدبیرِ تو تشویش خمارآخر شد

در شمار ارچہ نیاورد کسی حافظ را
شکر کاں محنت بیحد و شمارآخر شد

—

بحسن و خلق و وفا کس بیار مانرسد — ترا دریں سخن انکار کار مانرسد
اگرچہ حسن فروشاں بجلوہ آمدہ اند — کسی بحسن و ملاحت بیار مانرسد
بحق صحبت دیریں کہ ہیچ محرم راز — بیاریک جہت حق گزار ما نرسد
ہزار نقش برآید ز کلک صنع و یکی — بدلپذیریٔ نقش نگار مانرسد
ہزار نقد ببازار کائنات آرند — یکی بسکۂ صاحب عیار مانرسد
دریغ قافلۂ عمر کانچناں رفتند — کہ گرد شاں بھوائے دیار مانرسد
دل از رنج حسوداں مرنج و واثق باش — کہ بد بخاطر امیدوار مانرسد
چناں بزی کہ اگر خاک رہ شوی کس را — غبار خاطری از رہگذار مانرسد

بسوخت حافظ و ترسم کہ شرح قصۂ او
بسمع پادشہ کامگار ما نرسد

—

من و انکار شراب ایں چہ حکایت باشد
غالباً ایں قدرم عقل کفایت باشد
تا بغایت رہ میخانہ نمی دانستم
ورنہ مستوری ما تابچہ غایت باشد
زاہد و عجب و نماز و من و مستی و نیاز
تا ترا خود زمیان با کہ عنایت باشد
زاہدار راہ برندی نبرد معذورست
عشق کاریست کہ موقوف ہدایت باشد
من کہ شبہارہ تقوی زدہ ام بادف و چنگ
ایں زماں سر برہ آرم چہ حکایت باشد
بندۂ پیر مغانم کہ ز جہلم برہاند
پیر ما ہرچہ کند عین عنایت باشد
دوش ازیں غصہ نخفتم کہ رفیقی می گفت
حافظ از مست بودجای شکایت باشد

—

ستارۂ بدرخشید و ماہ مجلس شد
دلِ رمیدۂ مارا رفیق و مونس شد
نگار من کہ بہ مکتب نرفت و خط ننوشت
بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد
ببوئ او دل بیمار عاشقاں چو صبا
فدائی عارض نسریں و چشم نرگس شد
بصدر مصطبہ ام می فشاند اکنوں دوست
گدائے شہر نگہ کن کہ میر مجلس شد
خیال آب خصر بست و جام اسکندر
بجرعہ نوشی سلطاں ابوالفوارس شد
طرب سرای محبت کنوں شود معمور
کہ طاق ابروی یار منش مہندس شد
لب از ترشح مے پاک کن برائے خدا
کہ خاطرم بہزاراں گنہ موسوس شد
کرشمۂ تو شرابی بعاشقاں بپیمود
کہ علم بیخبر افتاد و عقل بے حس شد
چو زر عزیز وجودست نظم من آری
قبول دولتیاں کیمیاے ایں مس شد
زراہ میکدہ یاراں عناں بگردانید
چرا کہ حافظ ازیں راہ رفت و مفلس شد

یاری اندر کس نمی بنیم یاراں راچہ شد
دوستی کی آخر آمد دوستداراں راچہ شد
آب حیواں تیرہ گوں شد خضر فرخ پی کجاست
خوں چکید از شاخ گل باد بہاراں راچہ شد
کس نمی گوید کہ یاری داشت حق دوستی
حق شناساں راچہ حال افتاد یاراں راچہ شد

معلّی ازکان مروّت بنیاد سالہاست — تابش خورشید وسعی باد و باراں راچہ شد
شہریاراں بود و خاک مہرباناں ایں دیار — مہربانی کے سرآمد شہریاراں راچہ شد
گوی توفیق وکرامت درمیاں افگندہ اند — کس بمیداں درنمی آید سواراں راچہ شد
صد ہزاراں گل شگفت وبانگ مرغی برنخاست — عندلیباں راچہ پیش آمد ہزاراں راچہ شد
زہرہ سازی خوش نمی سازدمگرعودش بسوخت — کس ندارد ذوق مستی می گساراں راچہ شد

حافظ اسرار الٰہی کس نمی داند خموش
از کہ می پرسی کہ دور روزگاراں راچہ شد

—

سحرم دولت بیدار ببالیں آمد — گفت برخیز کہ آں خسرو شیریں آمد
قدحی درکش و سرخوش بتماشا بخرام — تابہبینی کہ نگارت بچہ آئیں آمد
مژدگانی بدہ ای خلوتی نافہ کشائی — کہ زصحرائے ختن آہوئے مشکیں آمد
گریہ آبی برخ سوختگاں باز آورد — نالہ فریادرس عاشق مسکیں آمد
مرغ دل باز ہوا دار کماں ابروئیست — ای کبوتر نگراں باش کہ شاہیں آمد
ساقیاے بدہ وغم مخور از دشمن و دوست — کہ بکام دل ما آں بشدو ایں آمد
رسم بدعہدی ایام چو دیدار بہار — گریہ اش برسمن وسنبل و نسریں آمد

چون صبا گفتۂ حافظ بشنید از بلبل
عنبر افشاں بتماشائے ریاحیں آمد

—

زاہد خلوت نشیں دوش بمیخانہ شد — از سر پیمان برفت با سرپیمانہ شد
صوفی مجلس کہ دی جام وقدح می شکست — باز بیک جرعہ می عاقل و فرزانہ شد
شاہد عہد شباب آمدہ بودش بخواب — باز بہ پیرانہ سر عاشق و دیوانہ شد
مغبچہ ای میگذشت راہزن دین و دل — درپئے آں آشنا از ہمہ بیگانہ شد
آتشِ رخسار گل خرمن بلبل بسوخت — چہرۂ خندانِ شمع آفت پروانہ شد
گریۂ شام و سحر شکر کہ ضایع نگشت — قطرۂ باران ما گوہر یک دانہ شد
نرگس ساقی بخواند آیت افسوں گری — حلقۂ اوراد ما مجلس افسانہ شد

منزل حافظ کنوں بارگہ پادشاست
دل بردلدار رفت جاں برجانا نہ شد

—

سحر بلبل حکایت با صبا کرد کہ عشق روی گل باما چہا کرد
ازاں رنگ رخم خون در دل افتاد وزاں گلشن بخارم مبتلا کرد
غلام ہمت آن نازنیم کہ کاری خیر بے روی و ریا کرد
من از بیگانگاں دیگر ننالم کہ بامن ہرچہ کرد آں آشنا کرد
گراز سلطاں طمع کردم خطا بود وراز دلبر وفا جستم جفا کرد
خوشش باد آں نسیم صبحگاہی کہ درد شب نشیناں را دوا کرد
نقاب گل کشید و ز زلف سنبل گرہ بند قبائے غنچہ وا کرد
بہر سو بلبل عاشق در افغاں تنعم از میاں باد صبا کرد
بشارت بر بکوئے می فروشاں کہ حافظ توبہ از زہد و ریا کرد
وفا از خواجگان شہر بامن
کمال دولت و دیں بوالوفا کرد

—

بیا کہ ترک فلک خوان روزہ غارت کرد ہلال عید بہ دور قدح اشارت کرد
ثواب روزہ و حج قبول آنکس برد کہ خاک میکدۂ عشق را زیارت کرد
بہائے بادۂ چوں لعل چیست جوہر عقل بیا کہ سود کسی برد کایں تجارت کرد
نماز در خم آں ابروانِ محرابی کسی کند کہ بخون جگر طہارت کرد
فغان کہ نرگس جماش شیخ شہر امروز نظر بدرد کشاں از سر حقارت کرد
حدیث عشق ز حافظ شنو نہ از واعظ
اگرچہ صنعت بسیار در عبارت کرد

—

یاد باد آنکہ نہانت نظری باما بود رقم مہر تو بر چہرۂ ما پیدا بود
یاد باد آنکہ چو چشمت بعتابم می کشت معجز عیسویت در لب شکر خا بود

یاد باد آنکہ صبوحی زدہ در مجلس انس — جز من ویار نبودیم و خدا با ما بود
یاد باد آنکہ رخت شمع طرب می افروخت — وین دل سوختہ پروانۂ نا پروا بود
یاد باد آنکہ در آں بزمگہ خلق و ادب — آنکہ او خندۂ مستانہ زدی صہبا بود
یاد باد آنکہ چو یاقوت قدح خندہ زدی — درمیان من ولعل تو حکایت ہا بود
یاد بادآنکہ نگارم چو کمر بر بستی — در رکابش مہ نو پیک جہاں پیما بود
یاد باد آنکہ خرابات نشیں بودم و مست — وانچہ در مسجدم امروز کمست آنجا بود

یاد باد آنکہ با صلاح شمامیشد راست
نظم ہر گوہر ناسفتہ کہ حافظ را بود

—

یاد آباد آنکہ سرکوئی تو ام منزل بود — دیدہ را روشنی از خاک درت حاصل بود
راست چوں سوسن وگل از اثرصحبت پاک — بر زباں بود مرا آنچہ ترا در دل بود
دل چو از پیر خرد نقل معانی می کرد — عشق می گفت بشرح آنچہ برو مشکل بود
آہ ازآں جوروتطاول کہ دریں دامگہ است — آہ ازاں سوز و نیازی کہ درآں محفل بود
در دلم بود کہ بے دوست نباشم ہرگز — چہ تواں کرد کہ سعی من و دل باطل بود
دوش بریاد حریفان بخرابات شدم — خم مے دیدم وخوں در دل و پا درگل بود
بس بگشتم کہ بپرسم سبب درد فراق — مفتی عقل دریں مسئلہ لایعقل بود
راستی خاتم فیروزہ بو اسحاقی — خوش درخشید ولی دولت مستعجل بود

دیدی آں قہقہۂ کبک خرامان حافظ
کہ ز سر پنجۂ شاہین قضا غافل بود

—

مسلماناں مرا وقتی دلے بود — کہ با وی گفتمی گر مشکلی بود
بگردابی چو می افتادم از غم — بتدبیرش امید ساحلے بود
دلے ہمدرد و یار مصلحت بیں — کہ استظہار ہر اہل دلی بود
زمن ضائع شد اندر کوئی جاناں — چہ دامن گیر یارب منزلے بود
ہنر بی عیب حرماں نیست لیکن — ز من محروم ترکے کی سائلی بود

بریں جان پریشاں رحمت آرید   کہ وقت کاردانی کاملی بود
مرا تا عشق تعلیم سخن کرد   حدیثم نکتۂ ہر محفلے بود

مگو دیگر کہ حافظ نکتہ دانست
کہ ما دیدیم محکم جاہلی بود

—

گرچہ بر واعظ شہر ایں سخن آساں نشود   تا ریا ورزد و سالوس مسلماں نشود
رندی آموز وکرم کن کہ نہ چنداں ہنرست   حیوانی کہ ننوشد می و انساں نشود
گوہر پاک بباید کہ شود قابل فیض   ورنہ ہر سنگ وگلی لو لو و مرجاں نشود
اسم اعظم بکند کار خود ای دل خوش باش   کہ بتلبیس و حیل دیو مسلماں نشود
عشق می ورزم و امید کہ ایں فن شریف   چوں ہنر ہای دگر موجب حرماں نشود
دوش می گفت کہ فردا بدہم کام دلت   سببی ساز خدایا کہ پشیماں نشود
حسن خلقی ز خدا می طلبم خوئے ترا   تا دگر خاطرِ ما از تو پریشاں نشود

ذرّہ را تانبود ہمت عالی حافظ
طالب چشمۂ خورشید درخشاں نشود

—

خوشست خلوت اگر یار یار من باشد   نہ بسوزم و او شمع انجمن باشد
من آں نگیں سلیماں بہیچ نستانم   کہ گاہ گاہ برو دست اہرمن باشد
روادار خدایا کہ در حریم وصال   رقیب محرم و حرماں نصیب من باشد
ہمائے گو مفگن سایۂ شرف ہرگز   درآں دیار کہ طوطی کم از زغن باشد
بیان شوق چہ حاجت کہ سوز آتش دل   تواں شناخت ز سوزی کہ در سخن باشد
ہوائے کوی تو از سر نمیرود آری   غریب را دل سرگشتہ با وطن باشد

بسان سوسن اگر دہ زبان شود حافظ
چو غنچہ پیش تواش مہر بر دہن باشد

—

دوش در حلقۂ ما قصۂ گیسوئے تو بود   تا دلِ شب سخن از سلسلۂ موی تو بود

دل کہ از ناوک مژگان تو در خوں می گشت　　باز مشتاق کمانخانۂ ابروئ تو بود

ہم عفااللہ صبا کز تو پیامی می داد　　ورنہ درکس نرسیدیم کہ از کوئ تو بود

عالم از شور و شرِ عشق خبر ہیچ نداشت　　فتنہ انگیز جہاں غمزۂ جادوئ تو بود

من سرگشتہ ہم از اہل سلامت بودم　　دام را ہم شکنِ طرۂ ہندوئ تو بود

بکشا بند قبا تا بکشاید دل من　　کہ کشادی کہ مرا بود ز پہلوئ تو بود

بوفائ تو کہ بر تربت حافظ بگذر

کز جہاں می شد و در آرزوئ روئ تو بود

—

صبا بہ تہنیت پیر می فروش آمد　　کہ موسم طرب و عیش و ناز و نوش آمد

ہوا مسیح نفس گشت و باد نافہ کشای　　درخت سبز شد و مرغ در خروش آمد

تنور لالہ چناں برفروخت باد بہار　　کہ غنچہ غرق عرق گشت و گل بجوش آمد

بگوش ہوش نیوش از من و بعشرت کوش　　کہ ایں سخن سحر از ہاتفم بگوش آمد

ز فکرِ تفرقہ باز آی تا شوی مجموع　　بحکم آنکہ چو شد اہرمن سروش آمد

ز مرغِ صبح ندانم کہ سوسنِ آزاد　　چہ گوش کرد کہ بادہ زباں خموش آمد

چہ جائے صحبت نا محرمست مجلس انس　　سر پیالہ بپوشانِ کہ خرقہ پوش آمد

ز خانقاہ بہ میخانہ میرود حافظ

مگر ز مستیِ زہد و ریا بہوش آمد

—

دوش دیدم کہ ملائک در میخانہ زدند　　گل آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند

ساکنانِ حرم سرّ و عفافِ ملکوت　　بامنِ راہ نشیں بادۂ مستانہ زدند

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید　　قرعۂ کار بنام منِ دیوانہ زدند

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ　　چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

شکرِ ایزاد کہ میان من و او صلح افتاد　　صوفیان رقص کناں ساغر شکرانہ زدند

آتش آں نیست کہ از شعلۂ او خندد شمع　　آتش آنست کہ در خرمنِ پروانہ زدند

کس چو حافظ نکشاد از رخِ اندیشہ نقاب

تا سرِ زلفِ سخن را بقلم شانہ زدند

واعظاں کایں جلوہ در محراب و منبر میکنند
چون بخلوت میروند آن کار دیگر می کنند
مشکلے دارم زِ دانشمند مجلس باز پرس
توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند
یارب ایں نو دولتاں را باخر خودشاں نشاں
کایں ہمہ ناز از غلام ترک و استر می کنند
اے گدائے خانقہ برجہ کہ در دیر مغاں
میدہند آبی کہ دلہارا توانگر می کنند

—

بکوی میکدہ یارب سحر چہ مشغلہ بود
کہ جوش شاہد و ساقی و شمع و مشعلہ بود
حدیث عشق کہ از حرف و صوت مستغنیست
بنالۂ دف و نی در خروش و ولولہ بود
مباحثی کہ در آں مجلس جنوں میرفت
ورائے مدرسہ وقال و قیل مسئلہ بود
دہان یار کہ درمان درد حافظ داشت
فغاں کہ وقت مروت چہ تنگ حوصلہ بود

—

بود آیا کہ در میکدہا بکشایند
گرہ از کار فروبستۂ ما بکشایند
اگر از بہر دلِ زاہد خود بیں بستند
دل قوی دار کہ از بہر خدا بکشایند
بصفائے دلِ رندانِ صبوحی زدگان
بس در بستہ بمفتاحِ دعا بکشایند
نامۂ تعزیتِ دخترِ رز بنوسید
تا ہمہ مغبچگان زلف دو تا بکشایند
گیسوئے چنگ ببرید بمرگ می ناب
تا حریفاں ہمہ خوں از مژہ ہا بکشایند
در میخانہ ببستند خدایا مپسند
کہ در خانۂ تزویر و ریا بکشایند
حافظ ایں خرقہ کہ داری تو ببینی فردا
کہ چہ زنار ز زیرش بدغا بکشایند

—

تا ز میخانہ و می نام و نشاں خواہد بود
سرما خاک رہِ پیر مغاں خواہد بود
حلقۂ پیر مغاں از ازلم در گوش است
برہما نیم کہ بودیم و ہماں خواہد بود
برسرِ تربت ما چو گزری ہمت خواہ
کہ زیارت گہِ رندانِ جہاں خواہد بود

—

چوں طہارت نبود کعبہ و بت خانہ یکیست　بنود خیر در آں خانہ کہ عصمت نبود

(ر)

الا اے طوطیِ گویائے اسرار　مبادا خالیت شکّر زِ منقار
سرت سبزو دلت خوش باد جاوید　کہ خوش نقشی نمودی از خطِ یار
سخن سربستہ گفتی با حریفاں　خدا را زیں معمہ پردہ بردار
بروی ما زن از ساغر گلابی　کہ خواب آلودہ ایم ای بخت بیدار
چہ رہ بود ایں کہ زد درپردہ مطرب　کہ می رقصند باہم مست و ہشیار
از آں افیوں کہ ساقی در می افگند　حریفاں را نہ سر ماند نہ دستار
سکندر را نمی بخشند آبی　بہ زور و زر میسر نیست ایں کار
بیا و حال اہل درد بشنو　بلفظ اندک و معنیِ بسیار
بت چینی عدوی دین و دلہاست　خداوندا دل و دینم نگہ دار
بہ مستوران مگو اسرارِ مستی　حدیث جاں مگو با نقش دیوار
بہ یمن دولتِ منصور شاہی　علم شد حافظ اندر نظم اشعار

خدا وندی بجای بندگان کرد
خداوند از آفاتش نگہ دار

—

اے صبا نکہتی از خاک رہ یار بیار　ببر اندوہ دل و مژدۂ دلدار بیار
نکتہ روح فزا از دہن دوست بگو　نامۂ خوش خبر از عالم اسرار بیار
تا معطر کنم از لطف نسیم تو مشام　شمۂ از نفحات نفس یار بیار
بہ وفای تو کہ خاک رہ آں یار عزیز　بے غباری کہ پدید آید از اغیار بیار
گردی از رہگذر دوست بکوریِ رقیب　بہر آسائش ایں دیدۂ خونبار بیار
خامی و سادہ دلی شیوۂ جانبازاں نیست　خبرے از برآں دلبر عیّار بیار
شکر آں را کہ تو در عشرتی اے مرغ چمن　باسیران قفس مژدۂ گلزار بیار
کام جاں تلخ شد از صبر کہ کردم بی دوست　عشوۂ زاں لب شیرین شکر بار بیار
روزگاریست کہ دل چہرۂ مقصود ندید　ساقیا آں قدح آئینہ کردار بیار

دلق حافظ بچہ از روبمیش رنگین کن
وانگہش مست و خراب از سر بازار بیار

—

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور　　کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور
اے دل غم دیدہ حالت بہ شود دل بد مکن　　ویں سر شوریدہ باز آید بساماں غم مخور
گر بہارے عمر باشد باز بر تخت چمن　　چتر گل در سر کشی اے مرغ خوشخواں غم مخور
دور گردوں گردد روزے بر مراد مانرفت　　دائما یکساں بناشد حال دوراں غم مخور
ہاں مشو نومید چوں واقف نہ از سرّ غیب　　باشد اندر پردہ بازیہائے پنہاں غم مخور
اے دل ارسیل فنا بنیاد ہستی برکند　　چوں ترا نوحست کشتی باں ز طوفاں غم مخور
در بیاباں گر بہ شوق کعبہ خواہی زد قدم　　سرزنشہا گر کند خار مغیلاں غم مخور
گرچہ منزل بس خطرناکست و مقصد بس بعید　　ہیچ راہی نیست کانرا نیست پایاں غم مخور
حال ما در فرقت جاناں وا برام رقیب　　جملہ میداند خدائے حال گرداں غم مخور
حافظا در کنج فقر و خلوت شبہائے تار
تا بود وردت دعا و درس قرآں غم مخور

—

باز گویم نہ دریں واقعہ حافظا تنہاست　　غرقہ گشتند دریں بادیہ بسیار دگر

—

ایں یک و دوم کہ مہلت دیدار مکنست　　دریاب کار ماکہ نہ پیداست کار عمر
تا کے مئے صبوح و شکر خواب بامداد　　ہشیار گردہاں کہ گذشت اختیار عمر

—

(ز)

اے سروِ ناز حسن کہ خوش میروی بناز　　عشاق را بناز تو ہر لحظہ صد نیاز
فرخندہ باد طلعت خوبت کہ در ازل　　ببریدہ اند بر قد سروت قبائے ناز
آنرا کہ بوے عنبر زلف تو آرزوست　　چوں عود گو بر آتش سودا بسوز و ساز
پروانہ راز شمع بود سوز دل ولے　　بے شمع عارض تو دلم را بود گداز

صوفی کہ بے تو توبہ زمی کردہ بود دوش بشکست عہد چوں در میخانہ دید باز
از طعنۂ رقیب نگردد عیار من چوں زر اگر برند مرا در دہان گاز
دل کز طواف کعبۂ کویت وقوف یافت از شوق آں حریم ندارد سر حجاز
ہردم بخون دیدہ چہ حاجت وضو چونیست بے طاق ابروی تو نماز مرا جواز
چوں بادہ باز برسرخم رفت کف زناں حافظ کہ دوش از لب ساقی شنیسد راز

—

خیزو در کاسہ زر آب طربناک انداز پیشتر زانکہ شود کاسہ سرخاک انداز
عاقبت منزل ماوادی خاموشان ست حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز
چشم آلودہ نظر از رخ جاناں دورست بر رخ او نظر از آئینۂ پاک انداز
بسر سبز تو اے سروکہ خاک شوم ناز از سر بنہ و سایہ بریں خاک انداز
دل مارا کہ ز مار سر زلف تو بخست از لب خود بہ شفاخانۂ تریاک انداز
ملک ایں مزرعہ دانی کہ ثباتی ندہد آتشے از جگر جام در املاک انداز
غسل در اشک زدم کاہل طریقت گویند پاک شو اوّل و پس دیدہ برآں انداز
یارب آں زاہد خود بیں کہ بجز عیب ندید دود آہیش در آیینہ ادراک انداز

چوں گل از نکہت او جامہ قبا کن حافظ
دیں قبا در رہ آں قامت چالاک انداز

(س)

گلعذاری ز گلستان جہاں مارا بس زیں چمن سایہ آں سرو رواں مارا بس
من وہم صحبتی اہل ریا دورم باد از گرانان جہاں رطل گراں مارابس
قصر فردوس بپاداش عمل می بخشند ماکہ رندیم و گدا دیر مغاں مارا بس
بنشیں بر لب جوئے و گزر عمر ببیں کایں اشارت ز جہانِ گذراں مارابس
نقد بازار جہاں بنگر و آزار جہاں گر شمارا نہ بس ایں سود و زیاں مارابس
یار با ماست چہ حاجت کہ زیادت طلبیم دولت صحبت آں مونس جاں مارابس
از در خویش خدا را بہ بہشتم مفرست کہ کوی تو از کون و مکاں مارا بس

حافظ از مشرب قسمت گلہ ناانصافیست
طبع چوں آب و غزلہائے رواں مارا بس

(ش)

کنار آب و پائے بید و طبع شعر و یاری خوش
معاشر دلبری شیریں و ساقی گلعذاری خوش
الا ای دولتے طالع کہ قدر وقت میدانی
گوارا بادت ایں عشرت کہ داری روزگاری خوش
ہر آنکس را کہ در خاطر ز عشق دلبری باریست
سپندی گو برآتش نہ کہ دارد کاروباری خوش
عروس طبع را زیور ز فکر بکری بندم!
بود کز دست ایام بدست افتد نگاری خوش
شب صحبت غنیمت داں و داد و خوشدلی بستاں
کہ مہتابے دلفروزست و طرف لالہ زاری خوش
مئے در کاسۂ چشمست ساقی را بنامیزد
کہ مستی میکند باعقل و مے بخشد خماری خوش
بغفلت عمر شد حافظ بیا با ما بہ میخانہ
کہ شنگولان خوشباشت بیا موند کارے خوش

—

ما آزمودہ ایم دریں شہر بخت خویش
بیروں کشید باید ازیں در طہ رخت خویش
از بس کہ دست میگزم و آہ میکشم
آتش زدم چو گل تیں لخت لخت خویش
دوشم ز بلبلی چہ خوش آمدکہ می سرود
گل گوش پہن کردہ ز شاخ درخت خویش
کائے دل تو شاد باش کہ آں یار تند خو

بسیار تند روئے نشیند ز بخت خویش
خواہی کہ سخت و ست جہاں برتو بگذرد
بگذر ز عہد ست و سخنہائے سخت خویش
وقتست کز فراق تو وز سوز اندروں
آتش در افگنم بہمہ رخت و پخت خویش
اے حافظ ار مراد میسر شدی مدام
جمشید نیز دور نماندی ز تخت خویش

(غ)

سحر بوئے گلستان و می شدم در باغ
کہ تا چو بلبل بیدل کنم علاج دماغ
بجلوۂ گل سوری نگاہ می کردم
کہ بود در شب تیرہ بروشنی چو چراغ
چناں بحسن و جوانی خویشتن مغرور
کہ داشت از دل بلبل ہزار گونہ فراغ
کشادہ نرگس رعنا ز حسرت آب از چشم
نہادہ لالہ ز سودا بجان و دل صد داغ
زباں کشیدہ چو تیغی بہ سرزنش سوسن
دہاں کشادہ شقایق چو مردم ایغاغ
یکے چو بادہ پرستاں صراحی اندر دست
یکے چو ساقی مستاں بکف گرفتہ ایاغ
نشاط و عیش و جوانی چو گل غنیمت داں
کہ حافظا نبود بر رسول غیر بلاغ

(ق)

مقام امن و مئے بیغش و رفیق شفیق
گرت مدام میسّر شود زہی توفیق

جہان و کار جہاں جملہ ہیچ بر ہیچست
ہزار بار من ایں نکتہ کردہ ام تحقیق
دریغ و درد کہ تا ایں زماں ندانستم
کہ کیمیائے سعادت رفیق بود رفیق
بما منی رود فرصت شمر غنیمت وقت
کہ در کمیں گہ عمرند قاطعان طریق
بیا کہ توبہ ز لعل نگارد خندۂ جام
حکایتیست کہ عقلش نمیکند تصدیق
اگرچہ موی میانت بچوں منی نرسد
خوشست خاطرم از فکر ایں خیال دقیق
حلاوتے کہ ترا درچہ ز نخدانست
بکنہ آں نرسد صد ہزار فکر عمیق
بخندہ گفت کہ حافظ غلام طبع توام
ببیں کہ تا بچہ حدم ہمی کند تحمیق

(ک)

اگر شراب خوری جرعۂ فشاں برخاک — از آں گناہ کہ نفعی رسد بغیر چہ باک
برو بہرچہ تو داری بخود دریغ مخور — کہ بے دریغ زند روزگار تیغ ہلاک
بخاک پائے تو اے سرو ناز پرور من — کہ روز واقعہ پاوامگیرم از سر خاک
چہ دوزخی چہ بہشتی چہ آدمی چہ پری — بمذہب ہمہ کفر طریقتست امساک
مہندس فلکی راہ دیرشش جہتی — چناں ببست کہ رہ نیست زیر دیر مغاک
فریب دختر رز طرفہ میزند رہ عقل — مباد تا بقیامت خراب طارم تاک

براہ میکدہ حافظ خوش از جہاں رفتی
دعائے اہل دلت باد مونس دل پاک

(ل)

تحصیل عشق و رندی آساں نمود اوّل   آخر بسوخت جانم در کسب ایں فضائل
حلاّج بر سردار ایں نکتہ خوش سراید   از شافعی نپرسند امثال ایں مسائل

(م)

حافظا تکیہ بر ایام چو سہو است و خطا   من چرا عشرت امروز بفردا فگنم

—

جائے کہ تخت و مسند جم میرود بباد   گر غم خوریم خوش نبود بہ کہ می خوریم

—

عشق بازی و جوانی و شراب لعل فام   مجلس انس و حریف ہمدم و شرب مدام
ساقیِ شکّر دہان و مطرب شیریں سخن   ہم نشینے نیک کردار و ندیمی نیک نام
شاہدی از لطف و پاکی رشک آب زندگی   دلبری در حسن و خوبی غیرت ماہ تمام
بزم گاہے دلنشاں چو قصر فردوس بریں   گلشنی پیرا منش چو روضۂ دارالسلام
صف نشیناں نیکخواہ و پیشہ کاراں با ادب   دوستداراں صاحب سرو حریفاں دوست دوکام
بادۂ گلرنگ و تلخ تیز و خوشخوار سبک   نقلش از لعل نگار و نقلش از یاقوت خام
غمزۂ ساقی بیغمائے خرد آہختہ تیغ   زلف جاناں از برائے صید دل گسترده دام
نکتہ دانی بذلہ گو چوں حافظ شیریں سخن   بخشش آموز جہاں افروز چوں حاجی قوام

ہر کہ ایں عشرت نخواہد خوشدلی بروئے گناہ
وانکہ ایں مجلس نجوید زندگی بروئے حرام

—

ہر چند پیر و خستہ دل و ناتواں شدم   ہرگہ کہ یاد روی تو کردم جواں شدم
شکر خدا کہ ہرچہ طلب کردم از خدا   بر منتہائے ہمت خود کامراں شدم
اے گلبن جوان بر دولت بخور کہ من   در سایۂ تو بلبل باغ جہاں شدم
اول ز تحت و فوق وجودم خبر نبود   در مکتب غم تو چنیں نکتہ داں شدم
قسمت حوالتم بخرابات می کند   ہر چند کا ین چنین شدم و آنچناں شدم
آں روز بردلم در معنی گشودہ شد   کز ساکنا درگہ پیر مغاں شدم

در شاہراہ دولت سرمد بخت بخت باجام مے بکام دل دوستاں شدم
از آں زماں کہ فتنۂ چشمت بمن رسید ایمن ز شر فتنۂ آخر زماں شدم
من پیرِ سال و ماہ نیم یار بے وفا ست برمن چو عمر میگذرد پیر ازاں شدم
دوشم نوید داد عنایت کہ حافظا
باز آ کہ من بعفو گناہت ضماں شدم

—

ز دست کوتہ خود زیرِ بارم کہ از بالا بلنداں شرمسارم
مگر زنجیر موی گیردم دست وگرنہ سرنشیدائی بر آرم
ز چشم من بپرس اوضاع گردوں کہ شب تا روز اختر می شمارم
بدیں شکرانہ می بوسم لبِ جام کہ کرد آگہ ز راز روزگارم
اگر گفتم دعای مے فروشاں چہ باشد حق نعمت می گزارم
من از بازوی خود دارم بسی شکر کہ زورِ مردم آزاری ندارم
سری دارم چوں حافظ مست لیکن
بلطفِ آں سری امیدوارم

—

من نہ آں رندم کہ ترک شاہد وساغر کنم محتسب داند کہ من ایں کار ہا کمتر کنم
من کہ عیب توبہ کاراں کردہ باشم بارہا توبہ از می وقت گل دیوانہ باشم گر کنم
عشق درِّ دانہ ست ومن غواص ودریا میکدہ سر فرو بردم در آنجا تا کجا سر بر کنم
لالہ ساغر گیرو نرگس مست و برما نام فسق داوری دارم بسے یارب کرا داور کنم
باز کش یکدم عناں اے ترک شہر آشوب من تاز اشک چہرہ راہت پر زر و گوہر کنم
من کہ از یاقوت ولعل اشک دارم گنجہا کی نظر در فیض خورشید بلند اختر کنم
چوں صبا مجموعۂ گل را بآب لطف شست کج دلم خواں گر نظر بر صفحۂ دفتر کنم
عہد و پیمان فلک رانیست چنداں اعتبار عہد با پیمانہ بندم شرط با ساغر کنم
من کہ دارم در گدائی گنج سلطانی بدست کے طمع در گردش گردونِ دوں پرور کنم
گرچہ گرد آلود فقرم شرم باد از ہمتم گر بآب چشمۂ خورشید دامن تر کنم

عاشقاں را گر در آتش می پسند و لطف دوست　　تنگ چشمم گر نظر در چشمۂ کوثر کنم

دوش لعلش عشوۂ میداد حافظ را ولی
من نہ آنم کز وی این افسانہا باور کنم

—

بعزم توبہ سحر گفتم استخارہ کنم　　بہار توبہ شکن میرسد چہ چارہ کنم
سخن درست بگویم نمی توانم دید　　کہ مے خورند حریفاں و من نظارہ کنم
چو غنچہ بالب خنداں بیاد مجلس شاہ　　پیالہ گیرم و از شوق جامہ پارہ کنم
بہ دور لالہ دماغ مرا علاج کنید　　گر از میانۂ بزم طرب کنارہ کنم
ز روئے دوست مرا چوں گل مراد شگفت　　حوالۂ سرِ دشمن بسنگ خارہ کنم
گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں　　کہ ناز بر فلک و حکم برستارہ کنم
مرا کہ نیست رہ و رسم لقمہ پرہیزی　　چرا ملامت رند شراب خوارہ کنم
بخت گل بنشانم بتی چو سلطانی　　ز سنبل و سمنش ساز طوق و یارہ کنم

زبادہ خوردن پنہاں ملول شد حافظ
ببانگ بربط و نے رازش آشکارہ کنم

—

دیدار شد میسر و بوس و کنار ہم　　از بخت شکر دارم و از روزگار ہم
زاہد برو کہ طالع اگر طالع منست　　جامم بدست باشد و زلف نگار ہم
ماعیب کس بمستی و رندی نمی کنیم　　لعل بتاں خوشست و مے خوشگوار ہم
اے دل بشارتے دہمت محتسب نماند　　وزمے جہاں پُر ست و بت مے گسار ہم
خاطر بدست تفرقہ دادن نہ زیر کیست　　مجموعۂ بخواہ و صراحی بیار ہم
برخکیان عشق فشاں جرعۂ لبش　　تا خاک لعل گوں شود و مشکبار ہم
آں شد کہ چشم بدنگراں بودی از کمیں　　خصم از میاں برفت و سرشک از کنار ہم
چوکائنات جملہ بہ بوئے تو زندہ اند　　اے آفتاب سایہ زما بردار ہم
چوں آب روئے لالہ و گل فیض حسن بترس　　اے ابر لطف برمن خاکی ببار ہم
حافظ اسیر زلف تو شد از خدا بترس　　وز انصاف آصف جم اقتدار ہم

برہان ملک و دین کہ زدست وزارتش — ایام کاں یمین شد و دریا یسار ہم
بریاد رائے انور او آسماں بصبح — جاں میکند فدا و کواکب نثار ہم
گوئے زمین ربودۂ چوگان عدل اوست — ویں بر کشیدہ گنبد نیلی حصار ہم
عزم سبک عنان تو در جنبش آورد — ایں پائدار مرکز عالی مدار ہم
تا از نتیجۂ فلک و طور دور اوست — تبدیل مہ و سال و خزان و بہار ہم

خالی مباد کاخ جلالش ز سروراں
وز ساقیان سروقد گلعذار ہم

—

دوستاں وقت گل آں بہ کہ بعشرت کوشیم — سخن اہل دلست ایں و بجاں می نوشیم
نیست درکس کرم و وقت طرب میگذرد — چارہ آنست کہ سجادہ بہ مئی بفروشیم
خوش ہوائیست فرح بخش خدایا بفرست — نازنینی کہ برویش مے گلگوں نوشیم
ارغنوں ساز فلک رہزن اہل ہنرست — چوں ازیں غصہ ننالیم و چرا نخروشیم
گل بجوش آمد و ازمے نزدیمش آبے — لاجرم زآتش حرمان و ہوس می جوشیم
می کشیم از قدح لالہ شرابے موہوم — چشم بد دور کہ بے مطرب و مے مدہوشیم

حافظ ایں حال عجب با کہ تواں گفت کہ ما
بلبلانیم کہ در موسم گل خاموشیم

—

سرم خوشست و بہانگ بلند میگویم — کہ من نسیم حیات از پیالہ میجویم
عبوس زہد بوجہ خمار ننشیند — مرید خرقۂ دردے کشان خوشخویم
شدم فسانہ بسرگشتگی و ابروئے دوست — کشید در خم چوگان خویش چوں گویم
گرم نہ پیر مغاں در بروئے بگشاید — کدام در بزنم چارہ از کجا جویم
مکن دریں چمنم سرزنش بخود روئی — چنانکہ پرورشم میدہند می رویم
تو خانقاہ و خرابات درمیانہ مبیں — خدا گواہ کہ ہر جا کہ ہست با اویم
غبار راہ طلب کیمیائے بہروزیست — غلام دولت آں خاک عنبریں بویم
ز شوق نرگس مست بلند بالائے — چو لالہ با قدح افتادہ بر لب جویم

بیار مے کہ بفتوائے حافظ از دل پاک
غبار زرق بہ فیض قدح فروشویم

—

(ن)

چندانکہ گفتم غم با طبیباں درماں نکردند مسکیں غریباں
آں گل کہ ہردم در دست بادیست گو شرم بادش از عندلیباں
یارب اماں دہ تا باز بیند چشم محبّاں روئے حبیباں
دُرج محبت بر مہر خود نیست یارب مبادا کام رقیباں
ای منعم آخر برخوان جودت تا چند باشیم از بے نصیباں
حافظ نگشتی شیدائے گیتی
گرمی شنیدی پند ادیباں

—

خدا را کم نشیں با خرقہ پوشاں رخ از رندان بے ساماں مپوشاں
دریں خرقہ بسی آلودگی ہست خوشا وقت قبائے مے فروشاں
دریں صوفی و شاں دردی ندیدم کہ صافی باد عیش درد نوشاں
تو نازک طبعی و طاقت نیاری گرانیہائے مشتی دلق پوشاں
چو مستم کردہ مستور منشیں چہ نوشم دہ دہٗ زہرم منوشاں
بیا و ز غبن ایں سالوسیاں بیں صراحی خوں دل و بربط خروشاں
ز دل گرمیٔ حافظ بر حذر باش
کہ دارد سینۂ چون دیگ جوشاں

—

بہار و گل طرب انگیز گشت و توبہ شکن بشادی رخ گل بیخ غم ز دل برکن
رسید باد صبا غنچہ در ہوا داری ز خود بروں شد و بر خود درید پیراہن
طریق صدق بیاموز از آب صافی دل براستی طلب آزادگی ز سرو چمن
ز دست برد صبا گرد گل کلالہ نگر شکنج گیسوئے سنبل ببیں بروئے سمن

عروس غنچہ رسید از حرم بطالع سعد بعینہ دل و دیں میبرد بوجہ حسن
صفیر بلبل شوریدہ و نفیر ہزار برائے وصل گل آمد برون زبیت حزن
حدیث صحبت خوبان و جام بادہ بگو
بقول حافظ و فتوای پیر صاحب فن

—

منم کہ شہرۂ شہرم بعشق ورزیدن منم کہ دیدہ نیالودہ ام بہ بد دیدن
وفا کنیم و ملامت کشیم و خوش باشیم کہ در طریقت ما کافریست رنجیدن
بہ پیر میکدہ گفتم کہ چیست راہ نجات بخواست جام مے و گفت عیب پوشیدن
مراد دل ز تماشائے باغ عالم چیست بدست مردم چشم از رخ تو گل چیدن
بے پرتی ازاں نقش خود زدم بر آب کہ تا خراب کنم نقش خود پرستیدن
برحمت سر زلف تو واثقم ورنہ کشش چو نبود از آنسو چہ سود کوشیدن
عنان بمیکدہ خواہیم تافت زیں مجلس کہ وعظ بی عملاں واجبست نشنیدن
ز خط یار بیاموز مہر با رخ خوب کہ گرد عارض خوبان خوشست گردیدن
مبوس جز لب ساقی و جام می حافظ
کہ دست زہد فروشاں خطاست بوسیدن

—

ز در درآ و شبستان ما منوّر کن دماغِ مجلس روحانیاں معطّر کن
اگر فقیہ نصیحت کند کہ عشق مباز پیالۂ بدہش گو دماغ را تر کن
بچشم و ابروئے جاناں سپردہ ام دل و جاں بیا بیا و تماشائے طاق و منظر کن
ستارۂ شب ہجراں نمی فشاند نور ببام قصر برآو چراغ مہ بر کن
بہ خازن جنت کہ خاک ایں مجلس بتحفہ برسوئے فردوس و عود مجمر کن
ازیں مرقّعہ و خرقہ نیک در تنگم بیک کرشمۂ صوفی و شم قلندر کن
چو شاہدانِ چمن زیر دست حسن تواند کرشمہ بر سمن و جلوہ بر صنوبر کن
فضول نفس حکایت بسی کند ساقی تو کار خود مدہ از دست و مے بساغر کن
حجاب دیدۂ ادراک شد شعاع جمال بیا و خرگہ خورشید را منور کن

طمع بقند وصال تو حدّ ما نبود حوالتم بہ لب لعل ہمچو شکر کن
لب پیالہ ببوس آنگہی بہ مستاں دہ بدیں دقیقہ دماغ معاشراں تر کن

پس از ملازمت عیش و عشق مہ رویان
ز کارہا کہ کنی شعر حافظ از بر کن

—

بالا بلند عشوہ گر نقش باز من کوتاہ کرد قصہ زہد دراز من
دیدی دلاکہ آخر پیری و زہد و علم بامن چہ کرد دیدۂ معشوقہ باز من
می ترسم از خرابی ایماں کہ می برد محراب ابروئے تو حضورے نماز من
گفتم بدلق رزق بپوشم نشان عشق غماز بود اشک و عیاں کرد راز من
مستست یارویاد حریفان نمی کند ذکرش بخیر ساقی مسکیں نواز من
یارب کے آں صبا بوزد کز نسیم آں گردد شمامۂ کرمش کارساز من
نقشی بر آب می زنم از گریہ حالیا تا کی شود قرین حقیقت مجاز من
برخود چو شمع خندہ زناں گریہ میکنم تا با تو سنگدل چہ کند سوز و ساز من
زاہد چو از نماز تو کاری نمیرود ہم مستی شبانہ و راز و نیاز من

حافظ ز گریہ سوخت بگو حالش ای صبا
باشاہ دوست پرور دشمن گداز من

—

بوسیدن لبِ یار اوّل زدست مگذار کاخر ملول گردی از دست و لب گزیدن

(ہ)

وصال او ز عمر جاوداں بہ خدا وندا مرا آں دہ کہ آں بہ
بشمشیرم زد و باکس نہ گفتم کہ راز دوست از دشمن نہاں بہ
بداغ بندگی مردن بریں در بجاں او کہ از ملک جہاں بہ
خدارا از طبیب من بپرسید کہ آخر کے شود ایں ناتواں بہ
گلی کاں پائمال سرو ماگشت بود خاکش ز خون ارغواں بہ
بخلدم دعوت ای زاہد مفرما کہ ایں سیب زنخ زاں بوستاں بہ

دلا دایم گدائے کوی اوباش بحکم آں کہ دولت جاوداں بہ
جوانا سر متاب از پند پیراں کہ رائی پیر از بخت جواں بہ
شی میگفت چشم کس ندیدست ز مروارید گوشم در جہاں بہ
اگرچہ زندہ رود آب حیاتست ولی شیراز ما از اصفہان بہ
سخن اندردہان دوست شکر
ولیکن گفتۂ حافظ ازاں بہ

—

(ی)

اے کہ با سلسلۂ زلف دراز آمدہ ای فرصتت باد کہ دیوانہ نواز آمدہ ای
ساعتے ناز مفرماد بگرداں عادت چوں پرسیدن ارباب نیاز آمدہ ای
پیش بالائے تو میرم چہ بصلح و چہ بجنگ چوں بہرحال برازندۂ ناز آمدہ ای
آب و آتش بہم آمیختۂ از لب لعل چشم بد دورکہ بس شعبدہ باز آمدہ ای
آفریں بر دل نرم تو کہ از بہر ثواب کشتۂ غمزۂ خود را بنماز آمدہ ای
زہد من با تو چہ سنجد کہ بیغمای دلم مست و آشفتہ بخلوت گہ راز آمدہ ای
گفت حافظ دگرت خرقہ شراب آلودہ است
مگر از مذہب ایں طائفہ باز آمدہ ای

—

لبش می بوسم و در می کشم می بآب زندگانی بردہ ام پی
نہ رازش می توانم گفت باکس نہ کس را می توانم دید باوی
لبش می بوسد و خوں میخورد جام رخش می بیند و گل میکند خو
بدہ جام مئے و از جم مکن یاد کہ میداند کہ جم کی بود و کے کی
بزن در پردہ چنگ ای ماہ مطرب رگش بخراش تا بخروشم از وی
گل از خلوت بباغ آورد مسند بساط زہد ہمچوں غنچہ کن طی
چو چشمش مست را مخمور مگذار بیاد لعلش اے ساقی بدہ می
نجوید جان از آں قالب جدائی کہ باشد خون جامش در رگ و پی

زبانت در کش ای حافظ زمانی
حدیث بے زباناں بشنواز نے

—

دیدم بخواب دوش کہ ماہ برآمدی — کز عکس روئے او شب ہجراں سر آمدی
تعبیر رفت یار سفر کردہ میرسد — اے کاش ہرچہ زود تراز در در آمدی
ذکرش بخیر ساقی فرخندہ فال من — کز در مدام با قدح و ساغر آمدی
خوش بودے ار بخواب بدیدی دیار خویش — تا یاد صحبتش سوئے ما رہبر آمدی
فیض ازل بزور و زرار آمدی بدست — آب خصر نصیبۂ اسکندر آمدی
آن عہد یاد با دکہ از بام و در مرا — ہردم پیام یار و خط دلبر آمدی
کے یافتی رقیب تو چندیں مجال ظلم — مظلومی ارشبی بدرِ داور آمدی
خامان رہ نرفتہ چہ دانند ذوق عشق — دریا دلی بجوی دلیری سر آمدی
آں کو ترا بسنگدلی کرد رہنموں — اے کاشکے کہ پاش بسنگی برآمدی

گر دیگرے بشیوۂ حافظ زدی رقم
مقبول طبع شاہ ہنر پرور آمدی

—

ایں خرقہ کہ من دارم در رہن شراب اولیٰ — ویں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ
چوں عمر تبہ کردم چنداں کہ نگہ کردم — در کنج خراباتی افتادہ خراب اولیٰ
چوں مصلحت اندیشی دورست ز درویشی — ہم سینہ پر از آتش ہم دیدہ پر آب اولیٰ
من حالت زاہد را با خلق نخواہم گفت — ایں قصہ اگر گویم با چنگ درباب اولیٰ
تابے سروپا باشد اوضاع فلک زیں ساں — در سر ہوس ساقی دردست شراب اولیٰ
از ہمچو تو دلداری دل برنکنم آری — چوں تاب کشم باری زاں زلف تتاب اولیٰ

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں آئے
رندی و ہوسناکی در عہدِ شبابِ اولیٰ

—

وقت را غنیمت داں آں قدر کہ بتوانی — حاصل از حیات اے جاں این دمست تادانی
کام بخشی گردون عمر در عوض دارد — جہد کن کہ از دولت داد عیش بستانی

باغبان چو من زینجا بگذرم حرامت باد　　گر بجاے من سروے غیر دوست بنشانی
زاہد پشیمان را ذوق بادہ خواہد کشت　　عاقلا مکن کاری کاورد پشیمانی
محتسب نمیداند ایں قدر کہ صوفی را　　جنس خانگی باشد ہمچو لعل رمانی
بادعائے شب خیزاں اے شکر دہاں مستیز　　در پناہ یک اسمست خاتم سلیمانی
پند عاشقاں بشنو و ز در طربِ باز آ　　کایں ہمہ نمی ارزد شغل عالمِ فانی
یوسف عزیزم رفت اے براداراں رحمے　　کز غمش عجب بینم حال پیر کنعانی
پیش زاہد رندی دم مزن کہ نتواں گفت　　با طبیب نامحرم حال درد پنہانی
میروی و مژگانت خون خلق میریزد　　تیز میروی جاناں ترسمت فرو مانی
دل ز ناوک چشمت گوش داشتم لیکن　　ابروئے کماندارت میبرد بہ پیشانی
جمع کن باحسانی حافظ پریشاں را　　اے شکنج گیسویت مجمع پریشانی

گر تو فارغی ازما اے نگار سنگیں دل
حال خود بخواہم گفت پیش آصف ثانی

دو یار زیرک و از بادۂ کہن دومنی　　فراغتی و کتابی و گوشۂ چمنی
من ایں مقام بہ دنیا و آخرت ندہم　　اگرچہ در پیم افتند ہردم انجمنی
ہرآنکہ کنج قناعت بگنج دنیا داد　　فروخت یوسف مصری بکمتریں ثمنی
بیاکہ رونق ایں کارخانہ کم نشود　　بزہد ہمچو توئے یا بفسق ہمچو منے
زتند باد حوادث نمی تواں دیدن　　دریں چمن کہ گلے بودہ است یاسمنے
ببیں در آئینۂ جام نقش بندی غیب　　کہ کس بیاد ندارد چنیں عجب زمنے
ازیں سموم کہ برطرفِ بوستاں بگذشت　　عجب کہ بوئے گلے ہست ورنگ نسترنی
بصبر کوش تو اے دل کہ حق رہا نکند　　چنیں عزیز نگینی بدست اہرمنی

مزاج دہر تبہ شد دریں بلا حافظ
کجاست فکر حکیمی ورائے برہمنی

سلامی چو بوی خوش آشنائی　　بداں مردم دیدۂ روشنائی
دردِ وی چو نور دل پارسایاں　　بداں شمع خلوت گہ پارسائی

نمی بینم از ہمدماں ہیچ برجائے دلم خوں شد از غصہ ساقی کجائی
زکوئی مغاں رخ مگرداں کہ آنجا فروشند مفتاح مشکل گشائی
عروس جہاں گرچہ درحد حسنست زحد میبرد شیوهٔ بیوفائی
دل خستہ من گرش ہمتی ہست نخواہد ز سنگین دلاں مومیائی
می صوفی افگن کجا می فروشند کہ در تابم از دست زہد ریائی
رفیقاں چنان عہد صحبت شکستند کہ گوئی نبودست خود آشنائی
مرا گر تو بگذاری اے نفس طامع بسے پادشائی کنم درگدائی
بیاموزمت کیمیائے سعادت ز ہمصحبت بدجدائی جدائی

مکن حافظ از جور دوراں شکایت
چہ دانی تو اے بندہ کارخدائی

—

گرازآں آدمیانی کہ بہشتت ہوست عیش با آدمی چند پری زادہ کنی
تکیہ برجائے بزرگاں نتواں زد بگزاف مگر اسباب بزرگی ہمہ آمادہ کنی

اجرہا باشدت ای خسرو شیریں دہناں
گر نگاہی سوی فرہاد دل افتادہ کنی

—

زاہد اگر بحور و قصور است امیدوار مارا شراب خانہ قصور است و یار حور

—

روندگان طریقت رہ بلا سپرند رفیق عشق چہ غم دارد از نشیب و فراز

بہ نیم شب اگرت آفتاب می باید
زروئے دختر گلچہر رز نقاب انداز

—

فدائے پیرہن چاک ماہرویاں باد ہزار جامهٔ تقوی و خرقهٔ پرہیز
فرشتۂ عشق نداند کہ چیست اے ساقی بخواہ جام و گلابی بخاک آدم ریز

—

بدور لالہ قدح گیروبی ریا می باش ببوئے گل نفسے ہمدم صبا می باش
نگویمت کہ ہمہ سالہ مے پرستی کن سہ ماہ می خور و نہ ماہ پارسا می باش

—

دلربائی ہمہ آں نیست کہ عاشق بکشند _ خواجہ آنست کہ باشد غم خدمتگارش

—

مکن از خواب بیدارم خدا را _ کہ دارم خلوتی خوش با خیالش

—

در رہ عشق کہ از سیل بلانیست گذار _ کردہ ام خاطر خود را بتمنائے تو خوش

—

وضع دوراں بنگر ساغر عسرت برگیر
کہ بہر حالتی اینست بہین اوضاع

○

Zikr-e-Hafiz

Sajjad Zaheer

Price : 200/-

مَیں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں